دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

شمارہ: ۹	ذی الحجہ ۱۴۳۹ھ-محرم ۱۴۴۰ھ مطابق ستمبر ۲۰۱۸ء	جلد: ۱۰۲

مدیر	نگراں
مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند-۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.: 2133/57
Vol. No. 102, Issue No. 9, September 2018 सितम्बर 2018
Printer Publisher :- Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
Owner :- Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 20/=	Annual Subscription Rs. 200/=

Annual by Regd Post. Rs. 440/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۴۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۷۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۷۰۰ روپے

فہرست مضامین

حرف آغاز	غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ	محمد سلمان بجنوری	۳
شخصیات	علامہ نیمویؒ اور آثار السنن	شایان احمد صدیقی	۷
عالم اسلام	ترکی کے تازہ حالات اوران کا پیغام اور سبق	مولانا یحییٰ نعمانی	۱۶
ذکر رفتگاں	جانشین حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ	مولانا نور عالم خلیل امینی	۲۸
//	حضرت مولانا ڈاکٹر محمد مصطفےٰ اعظمیؒ	مولانا اختر امام عادل قاسمی	۳۷
//	مفکر ملت مولانا عبداللہ صاحب کاپودرویؒ		
	نقوش وتاثرات	مولانا اشرف عباس قاسمی	۴۷
احوال وکوائف		مولانا محمد اللہ قاسمی	۵۵

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ایک سال کے لیے اگر بذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں تو 440/= روانہ فرمائیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ

محمد سلمان بجنوری

مدارس اسلامیہ اپنے روز قیام ہی سے دو قسم کی ذہنیتوں کا نشانہ رہے ہیں: ایک تو وہ جس نے مدارس کے وجود کو کبھی قبول ہی نہیں کیا اوران کو اپنے مذموم مقاصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا، یہ استعماری یا کفریہ طاقتوں کی نمائندگی کرنے والی ذہنیت تھی۔اس کو چوں کہ مغلیہ سلطنت کے بعد مسلسل اقتدار کی علانیہ یا خفیہ سر پرستی حاصل رہی یہاں تک کہ آزادی کے بعد بدلے ہوئے اقتدار میں بھی کم وبیش وہی صورت حال رہی اس لیے مدارس کے خلاف اس کی سرگرمیاں زیادہ راست طور پر اور کھلی مخالفت کے انداز میں سامنے آتی رہیں، اوراُن سے اگر چہ مدارس کونقصان بھی پہنچتا رہا؛ لیکن اس نقصان کی نوعیت ایسی ہی تھی جیسی کھلے دشمن سے پہنچنے والے نقصان کی ہوتی ہے، کہ اس سے متاثر ہونے والا، خواہ کتنا ہی نقصان اٹھا رہا ہو، ہمدردی سے محروم نہیں ہوتا اوراس کے وجود پر سوالیہ نشان کھڑا نہیں ہوتا؛ بلکہ بسا اوقات ہمدردی میں اضافہ ہی ہوجاتا ہے۔

لیکن مدارس کے خلاف کام کرنے والی دوسری ذہنیت اگر چہ دوسروں کی نمائندہ نہ ہو اوراس کو اُن کو آلۂ کار بھی نہ کہا جاسکتا ہو؛ لیکن وہ کام اُن ہی کا کرتی ہے اوراس کی محنت سے پہنچنے والا نقصان بھی مدارس کو کمزور کرکے بالواسطہ غیروں ہی کی خدمت انجام دیتا ہے اور چوں کہ وہ اپنوں کی جانب سے ہوتی ہے، اس لیے وہ بہت سے اپنے لوگوں کو متاثر کردیتی ہے، اس لیے اس کی سنگینی نتائج کے اعتبار سے زیادہ ہوجاتی ہے۔

سردست اسی دوسری ذہنیت کے اٹھائے ہوئے چند نکات پر اختصار کے ساتھ کچھ عرض کرنا ہے۔

اس ذہنیت کے حاملین جو عام طور پر اپنے ہی لوگوں میں سے ہوتے ہیں، اُن کی نیت کے بارے میں تو کچھ کہنا مناسب نہیں، اگر چہ اُن میں سے بعض کا جارحانہ انداز اُن کی نیت کے بارے میں

شکوک وشبہات پیدا کرتا ہے؛ لیکن اس کو نظر انداز کرکے نفسِ مضمون پر ہی بات کرتے ہیں، اس لیے اُن میں کسی کی تعیین بھی نہیں کی جارہی ہے، اگرچہ اُن کو تلاش کرنا اور پہچاننا مشکل نہیں ہے۔ ایسے لوگ کسی بھی عصری تعلیم کے ادارے میں یا کسی بھی اخبار کے کالموں میں آسانی کے ساتھ مل سکتے ہیں۔

اس قسم کے حضرات کی تحریروں، کتابوں اور مقالات ومضامین میں یوں تو طرح طرح کی باتیں مختلف انداز سے کہی جاتی ہیں؛ لیکن بنیادی طور پر اُن کو چند مرکزی نکات میں سمیٹا جاسکتا ہے۔

(۱) **نصاب تعلیم**: مدارس کے بارے میں خامہ فرسائی کرنے والے اکثر حضرات کی گفتگو اکثر وبیشتر یا زیادہ شدت کے ساتھ نصاب تعلیم کے مسئلے پر ہوتی ہے، اُن کے خیال میں مدارس کا نصاب تعلیم فرسودہ، ازکاررفتہ اور جمود کا شکار ہے، جس کو مدارس نے تقدس کا درجہ دے کر ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھارکھی ہے اور وہ تین سو سال پرانے اس نصاب کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔

اس سلسلے میں نہایت اختصار کے ساتھ صرف دو باتیں عرض کی جاتی ہیں: پہلی بات تو یہ کہ نصاب میں کسی بھی قسم کی تبدیلی نہ کرنے کا الزام، درحقیقت ناواقفیت پر مبنی ہے، اگر یہ حضرات صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کے نصاب اور آج کے نصاب کا موازنہ کرلیں تو بے شمار تبدیلیاں نظر آجائیں گی اور جہاں تبدیلی نظر نہیں آتی اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ توجہ نہیں ہوئی؛ بلکہ وہاں تبدیلی کو مدارس کے مقاصد سے ہم آہنگ نہیں سمجھا گیا؛ اس لیے تبدیلی نہیں کی گئی۔

دوسری بات مقاصد ہی سے متعلق ہے اور مدارس کے نصاب پر غور کرنے کے باب میں یہی بنیادی نکتہ ہے اور وہ یہ کہ مدارس کی حیثیت محض ایک تعلیمی ادارہ کی نہیں ہے جو کچھ لوگوں کو پڑھانے لکھانے کے لیے قائم کیا گیا ہو؛ بلکہ اُن مدارس کا مرکزی مقصد علوم اسلامیہ کی حفاظت یا بالفاظ دیگر، نبوت کی علمی میراث کو اس کی حقیقی روح اور مکمل مزاج کے ساتھ محفوظ رکھنا اور اگلی نسلوں تک منتقل کرنا ہے، یہ کوئی سائنس کا نصاب نہیں ہے جس کی حفاظت ہی تبدیلی میں ہے اور اس کی ترقی کا راز ہی اس کا روز بروز نئی شکل اختیار کرنا اور نئے نئے تجربات سے مستفید ہونا ہے۔ اس کے برخلاف علوم نبوت کا تو سارا اعتبار اُن کی قدامت ہی میں ہے، اس لیے اس نصاب کو اسکول کالج کے نصاب پر قیاس کرنا بڑی نادانی کی بات ہے۔

ہاں اپنی ضروریات کی حد تک طالب علم کی معلومات میں اضافہ کرنا ایک ضرورت ہے جس پر عام طور پر مدارس میں توجہ بھی ہے اور اس سے بڑھ کر بلند پایہ دعوتی مقاصد کے لیے ضروری علوم، معلومات اور زبانوں کا معاملہ ہے، اس کے لیے تخصص کے انداز پر کام ہونا چاہئے اور کسی درجہ میں

ہو بھی رہا ہے، پھر یہ کام مدارس کے متعینہ نظام سے الگ بھی کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ معتبر علماء کی نگرانی میں ہوتو اس ضرورت کی تکمیل بھی ہوجائے گی۔

(۲) معیارتعلیم کا مسئلہ: بعض لکھنے والوں کی تحریرات میں مدارس کے معیارِ تعلیم پر بھی بات آتی ہے یہ بات اگرچہ وہ زیادہ منصفانہ انداز سے پیش نہیں کرتے؛ لیکن پھر بھی یہ بات قابل توجہ ہے۔منصفانہ انداز سے مراد یہ کہ یہ صرف مدارس کا مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ ہر شعبۂ تعلیم اس انحطاط کا شکار ہے اوراس کے کچھ ایسے اسباب بھی ہیں جو پہلے اس درجہ میں نہیں تھے، آج کے دور میں انٹرنیٹ کے ذریعہ ہر شعبۂ زندگی میں جو تبدیلی آئی ہے اور اس کی وجہ سے جو ناروا ترغیبات اور خرمن ایمان واخلاق؛ بلکہ خرمن عقل کو خاکستر کردینے والی جو مسموم آگ پھیلی ہوئی ہے وہ صرف معیارِ تعلیم ہی نہیں؛ بلکہ اس سے پہلے اوراس سے بڑھ کر نظام تربیت کے لیے مہلک ثابت ہوئی ہے اور یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے؛لیکن اس کے باوجود معیار تعلیم اور معیار تربیت دونوں کے سلسلے میں سنجیدگی اختیار کرنا اوراس کے لیے عملی صورتیں اختیار کرنا مدارس کے لیے از بس ضروری ہے۔جس کی طرف دارالعلوم دیوبند کی جانب سے پوری ذمہ داری کے ساتھ رابطۂ مدارس اسلامیہ عربیہ کے پلیٹ فارم سے توجہ دلائی جاتی رہتی ہے اور عملی کوششیں جاری ہیں۔

(۳) مالیات کا مسئلہ: اس سلسلے میں کئی طرح کی باتیں سامنے آتی ہیں، پہلی تو زکوۃ سے متعلق ہے، کچھ لوگوں کو مدارس کا زکوٰۃ وصول کرنا ہی ناپسند ہے؛ حالانکہ مدارس میں آکر زکوٰۃ اُس طبقے تک پہنچتی ہے جو مستحق ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیم وتعلّم کے افضل ترین عمل میں مشغول ہے، ہاں اس سلسلے میں اصول کی رعایت ضروری ہے اور جہاں اس میں کوتاہی ہو اس کی اصلاح واجب ہے۔

مدارس کی مالیات کے باب میں سرکاری امداد کا مسئلہ بھی زیر بحث آتا ہے۔اس سلسلے میں سرکاری امداد لینے والے مدارس کی کارکردگی اگر مطلوبہ شرائط اور معیار کے مطابق نہ ہوتو اس پر تنقید بجا ہے؛لیکن اس کے دائرے میں اُن مرکزی اداروں کو نہیں لایا جاسکتا جو روز اوّل سے اس کے مخالف ہیں؛ حالانکہ یہاں پر یہ بھی عجیب بات ہے کہ بعض لکھنے والوں نے سرکاری امداد نہ لینے کے رجحان کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوری دور میں عوامی پیسہ سے ملنے والی امداد قبول ہونی چاہئے؛ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ امداد دے کر اپنی بات منوانے کا جبر کرنے میں جمہوری حکومتیں سلطانی ایوانوں سے پیچھے نہیں ہیں جس کے مفاسد سے شاید ہی کوئی ناواقف ہو۔اسی لیے دارالعلوم دیوبند اوراس کے ہم خیال تمام مرکزی مدارس، سرکاری امداد لینے یا مدرسہ بورڈ سے الحاق کرنے کی

مخالفت کرتے رہے ہیں۔

مدارس کی مالیات کے موضوع پر بات کرتے ہوئے یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ ملت اسلامیہ کی دینی ضروریات کی تکمیل کرنے والے اداروں کی حیثیت سے مدارس اوراُن کے خدام کی مالی یا معاشی کفالت تو قدرتی طور پر ملت کی ذمہ داری ہے (اور ملت ماشاء اللہ یہ ذمہ داری ادا بھی کررہی ہے) تو اس کو موضوع بحث بنانا کہاں کا انصاف ہے؟

مذکورہ بالا تین نکات پر اختصار کے ساتھ یہ چند سطور لکھی گئی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان تین امور پر اوران کے علاوہ بہت سے موضوعات پر تفصیلی اور منصفانہ گفتگو کی ضرورت ہے؛ مگر محسوس ایسا ہوتا ہے کہ مدارس کے بارے میں بات کرتے ہوئے عام طور پر گہرے غور وفکر یا ضروری سنجیدگی سے کام نہیں لیا جاتا۔ ابھی چند ماہ قبل ایک معروف صاحب قلم نے مدارس کے مستحق زکوٰۃ ہونے پر بحث کرتے ہوئے استحقاق زکوٰۃ کے لیے ایک نیا معیار مقرر فرمایا جس کی رو سے نصاب تعلیم میں انگریزی زبان وعصری علوم کی شمولیت کو استحقاق زکوٰۃ کی شرط قرار دیا اوراپنے اس مزعومہ معیار کے مطابق چند مدارس کی فہرست بھی تحریر فرمائی جواُن کے خیال میں زکوٰۃ کی رقم کا صحیح مصرف ہیں۔ لطف کی بات یہ کہ اس میں نہ دارالعلوم دیوبند کا نام شامل تھا نہ مظاہر علوم سہارنپور کا، نہ اس مزاج ومذاق کے کسی بھی ادارے کا۔ اس قسم کے اظہارِ خیال سے لوگ کس قسم کی تنگ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اس پر حیرت ہوتی ہے، خصوصاً اس لیے کہ ان صاحب کا شمار مدارس کے ''کرم فرما'' طبقے میں بھی نہیں ہوتا۔ یہاں پر یہ بات بھی مناسبت کی بنیاد پر آ گئی ورنہ اصل مخاطب تو وہی طبقہ ہے جو اپنے خیال میں اصلاح کی بات کرتا ہے؛ لیکن اس کا طرز عمل اس مقصد سے میل نہیں کھاتا۔

ان تمام ہی حضرات سے بڑی دل سوزی کے ساتھ عرض ہے کہ اس وقت اس بے سہارا ملت کی اہم اورمرکزی طاقت یہ مدارس ہی ہیں۔ خدارا ان کو کمزور کرنے کی کوشش کرکے ان طاقتوں کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ نہ بنیں جو عالمی سطح پر دینی تعلیم کے نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے یا اس کا قبلہ بدلنے کے لیے اپنے تمام وسائل کے ساتھ سرگرم ہیں اور جو سیاست ومعیشت کے میدانوں میں اپنے مقاصد کی تکمیل کرنے کے بعد اب مسلمانوں کے خرمن دین وایمان کو خاکستر کرنے کے لیے بگولے اٹھارہی ہیں۔ ع

کہ یہ دھبہ بھی کیوں باقی رہے صحرا کے دامن پر

❊ ❊ ❊

علامہ نیمویؒ اور آثار السنن

(۲)

از: شایان احمد صدیقی
متعلّم تخصص فی علوم الحدیث، بنوری ٹاؤن کراچی

جلالت شان

علامہ نیمویؒ نے صرف چوالیس سال کی عمر پائی۔ آپ نے پچیس سے زیادہ وقیع علمی یادگار چھوڑی ہیں۔ آپ کی تصنیف ''آثار السنن'' کو شہرت دوام حاصل ہے۔ تفسیر، حدیث، ادب، فقہ، طب، شاعری کوئی ایسا علمی عنوان نہیں جس پر آپ کی تحقیقات نے اہل علم سے داد وصول نہ کی ہو اور امت آپ کے تبحر علمی پر اعتماد نہ کرتی ہو۔ آپ کے شیوخ اور اساتذہ سے لے کر ہم عصر حضرات اہل علم تک سب ہی نے آپ کی تحقیقات کو وقعت نظر سے دیکھا ہے اور داد تحسین پیش کی ہے۔ یہاں چند اہل علم کی رائے پیش کی جاتی ہے جس سے آپ کی جلالت شان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت شاہ محمد عبدالحق مہاجر مکیؒ: علامہ نیمویؒ نے ''آثار السنن'' کے چند مطبوعہ اجزا حضرت مولانا شاہ عبدالحق الہ آبادی مہاجر مکیؒ کی خدمت میں دعا اور ان روایات کی اجازت سند کے لیے مکہ مکرمہ بھیجے تو حضرت مولانا شاہ عبدالحقؒ نے مسجد حرام میں ہاتھ اٹھا کر کتاب اور مؤلف کی مقبولیت کے لیے دعا فرمائی اور اپنی طرف سے تمام علوم وفنون اسناد تفسیر، حدیث فقہ اور تصوف و اوراد کی تحریری سند بھی ارسال فرمائی۔

حضرت شاہ عبدالحق نے اپنی تحریری اجازت میں علامہ نیمویؒ کے متعلق لکھا:

''التمس منی الشیخ الفاضل السابق فی حلیة الفضائل الباذل فی تحصیل العلوم الشریعة الجهد المشمر فی اقتناصها عن ساعد الجد مولانا العلامة الفهامة المحقق المدقق المولوی محمد ظهیر احسن ادام الله بقائه وزاد کل یوم فی مصاعد الفضل ارتقاءه الإجازة فیما تجوز لی روایته وتصح لی درایته فاحببته لذلك''(۷)

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ: شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے علامہ نیمویؒ کے متعلق ارشاد فرمایا: ''علامہ نیمویؒ علم حدیث میں اپنے استاد علامہ عبدالحی لکھنویؒ سے فائق ہیں''(۸)۔

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ: حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ علامہ نیمویؒ کے ہم عصر ہیں۔ آپ نے علامہ نیموی کے علمی مقام کا اعتراف فرمایا ہے۔علامہ کشمیریؒ نے مسئلہ رفع یدین پر اپنی معرکۃ الآرا، کتاب ''نیل الفرقدین'' میں علامہ نیمویؒ کی تحقیقات کو قال الشیخ النیموی کہہ کر نقل فرمایا ہے۔

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ علامہ نیمویؒ کے علوم وتحقیقات سے بہت متاثر تھے۔آپ نے علامہ نیموی کی شان میں عربی میں ایک لاجواب قصیدہ لکھا جو'' آثارالسنن'' کے ساتھ مطبوعہ ہے۔ علامہ کشمیری کا یہ قصیدہ عربی ادب کا ایک شاہکار ہے۔اس کا کچھ حصہ مولانا عبدالرشید فوقانی نے القول الحسن میں بھی نقل کیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رویت وطبت نفسا فی ارتواء   وعدت فازدری ماء السماء
بحبی ذا المناقب والمعالی   شریف المجد غطریف العلاء
کریم الخلق محمود السبحایا   خلیقا للحامد والثناء
وحید العصر محسود الندید   سدید القول فی حسن الصفاء
رفیع القدر ذو القدر الرفیع   باعلال الروایة وانتقاء
ظهیر الحق مولانا الظهیر   اضاء الأرض فی نور اهتداء
ولا تستطیع انور مدح فضله   مرام ذاك فی غیر الرجاء
فمد له الإلهُ ظلیل ظل   وجازاه بخیر من جزاء(۹)

ترجمہ: (علامہ نیموی کے فیوضات سے) میں سیراب ہوگیا اور جان سیرابی سے پاکیزہ ہوگئی، اور (اب ان کی مدح کا حق ادا کرنا) یوں گویا آسمان کے پانی (بارش) کی توہین کررہا ہوں۔

خوبیوں والے، اعلی مرتبے والے، بلند مرتبہ والوں کے سردار اور بلندیوں کے بڑے کی محبت کی وجہ سے۔

وہ یکتائے زمانہ ہمسروں کے رشک، حسن وکمال میں صاف گو ہیں۔

روایات کے نکات اور تحقیق میں نہ صرف بلند مرتبہ ہیں، بلند مرتبہ ہونے ہی کے لائق ہیں۔

مولانا ظہیر الحسن حق کے مددگار ہیں، ان کی رہنمائی سے روئے زمین کو روشن کردیا ہے۔

ان کے مقام کی تعریف انور کے بس میں نہیں، (ان کی تعریف کرنا) حقیقت کے بجائے محض باتیں ہیں۔

پس ان کے عظیم الشان فیض کو اللہ تعالی بڑھاتا رہے، اور اپنے انعامات میں سے بہترین انعام سے انھیں نوازتا رہے۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ لکھتے ہیں: ''حضرت استاذ (علامہ کشمیری) فن حدیث میں علامہ ممدوح (علامہ نیموی) کا مقام بہت بلند مانتے تھے اور معرفت علل واسانید میں ہندوستان کے کسی دوسرے عالم کو ان کا عدیل ومثیل نہیں قرار دیتے تھے۔ اس عاجز کو خوب یاد ہے یہاں تک فرماتے تھے کہ مولانا ظہیر احسن صاحب مولانا عبدالحئی صاحب (لکھنوی فرنگی محلی) کے شاگرد ہیں لیکن صناعت حدیث میں ان سے بہت فائق ہیں''(۱۰)۔

شہزادہ مرزا زبیرالدین زبیرؔ: شہزادہ مرزا زبیرالدین زبیر بادشاہان مغلیہ کی اولاد سے ہیں۔ اپنے وقت کے مشہور صاحب دیوان شاعر تھے۔ شاعری میں علامہ نیموی سے اصلاح لیتے تھے۔ اپنے دیوان ''چمنستان سخن'' المعروف دیوان زبیر مطبوعہ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء میں علامہ نیمویؒ کے متعلق فرماتے ہیں:

جب سے شوق نیموی سے ہے تلمذ اے زبیر پایہ کیسا بڑھ گیا تقریر کا تقدیر کا
زنگ آلودہ ہے گو جوہر میری شمشیر کا پر نبیرہ خاص ہوں سلطان عالمگیر کا

حضرت شوق کا ہے فیض زبیر
تجھ میں ایسی جو خوش بیانی ہے

نواب کلب علی خان بہادر مرحوم: نواب کلب علی خان بہادر والئی رامپور اہل علم کے قدردان تھے۔ جب فن لغت میں علامہ نیموی کی ازاحۃ الاغلاط دیکھی تو آپ کی علمیت اور فنی گرفت کی تعریف کی اور دربار رامپور میں آپ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے دعوت دی اور خوش آمدید کہا۔

مولانا حسرتؔ موہانی اور دیگر شعراء: علامہ نیموی کی کتاب ''ازاحۃ الاغلاط'' کو اردو کے مشہور شاعر اور ادیب علامہ حسرتؔ موہانی نے ۱۹۱۸ھ میں اردو پریس علی گڑھ سے شائع کیا۔ اردو، فارسی کے شعراء اور ادباء بھی آپ کے نیازمند تھے۔ مولانا حسرتؔ موہانی اور علامہ محمد اقبال مرحوم کے استاد داغؔ دہلوی مرحوم کے علامہ نیموی سے نیازمندانہ تعلقات تھے(۱۱)۔

علم حدیث کی طرف میلان: ابتداء میں علامہ نیمویؒ پر ذوق شعر وادب کا غلبہ تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ادبی شغف کی نذر کردیا تھا۔ غزل، قصائد اور مثنوی لکھ کر اس فن میں خوب نام کمایا۔ ''ازاحۃ الاغلاط، اصلاح، سرمہ تحقیق، ایضاح، نغمہ راز، سوز وگداز، یادگار وطن اور سیر بنگال'' وغیرہ لکھ کر اساتذہ فن کی صف میں اپنی جگہ بنائی؛ لیکن مشیت ایزدی کچھ اور تھی، قسام ازل نے آپ کو اس کام کے لیے پیدا نہیں کیا تھا۔ قدرت کو ان سے بڑا کام لینا تھا؛ اس لیے خواب میں حضور ﷺ کی زیارت ہوئی اور تعبیر کی صورت میں یہ بات ذہن نشین کرائی گئی کہ تم حدیث کی خدمت کروگے، علامہ نیمویؒ نے ''التعلیق الحسن'' میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"انی رایت ذات لیلة فی المنام أنی أحمل فوق راسی جنازة النبی ﷺ فعبرت هذه الرویا الصالحة بأن أکون حاملا لعلمه إن شاء الله العلام. ثم شمرت عن ساق الجد و اشتغلت بالحدیث حتی وفقنی الله لتالیف آثار السنن".

''میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ نبی ﷺ کا جنازہ اپنے سر پر اٹھائے ہوا ہوں، میں نے اس متبرک خواب کی تعبیر یہ نکالی کہ میں ان شاء اللہ علم حدیث کا حامل ہوں گا۔ پھر میں نے کمر کس لی اور حدیث میں مشغول ہوگیا۔ یہاں تک کہ خدا نے مجھے آثار السنن کی تالیف کی توفیق بخشی''۔

اسی طرح جیسے جیسے خواب میں حضور ﷺ کی زیارت ہوتی رہی آپ کا علم حدیث سے اشتغال بڑھتا گیا۔ اس کے علاوہ علامہ عبدالحئی لکھنویؒ جیسے محدث کی صحبت اور خاندانی ماحول نے اس شوق پر مہمیز کا کام کیا۔

آثار السنن کی تالیف کا پس منظر: علامہ نیمویؒ کے دور میں تقلید اور عدم تقلید کے مابین ایک جنگ جاری تھی اور ہر سو اس بحث کے چرچے تھے۔ طرفین سے اس موضوع پر کتابیں لکھی جا رہی تھیں۔ مناظروں کا بازار گرم تھا۔ عدم تقلید کے قائلین کی جانب سے دیگر دلائل کے ساتھ ساتھ حنفیت کو رائے اور قیاس پر مبنی گردانا جا رہا تھا۔ خود علامہ کے استاد عبدالحئی لکھنویؒ اور نواب صدیق حسن خانؒ کے مابین تحریری مناظرے ہوے۔ دوسری جانب احناف کے ذخیرۂ احادیث میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تھی جو خالص محدثانہ رنگ میں ہوتے ہوئے بھی حنفی مسلک کی بھی مؤید ہوتی۔ محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ لکھتے ہیں:

''ہندوستانی علمائے اسلام میں حنفی نقطہ نظر سے غالباً سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ایک مجموعۂ احادیث ''فتح المنان فی تائید مذہب النعمان'' کے نام سے تالیف فرمایا۔ یہ مجموعہ تقریبا ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے، مگر وہ فقہی رنگ میں لکھی گئی ہے اور اس میں یہی رنگ نمایاں ہے۔ ہندوستان کے ایک اور عالم جن کا سکہ بلادِ اسلامیہ میں بیٹھا ہوا ہے سید مرتضی بلگرامی زبیدیؒ ہیں انھوں نے بھی اس نقطہ نظر سے ایک کتاب لکھی جس کا نام ''عقود الجواہر المنیفۃ'' ہے۔ اس میں فقہی مباحث نہیں ہیں؛ مگر اس کے ساتھ وہ جرح وتعدیل رواۃ اور نقد احادیث کے فنی مباحث سے بھی قریب قریب خالی ہے''۔

ان حالات میں اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ حدیث شریف میں کوئی ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں مختلف کتب حدیث سے ایسی روایات جمع کی جائیں جو فقہ حنفی کی موید ہوں؛ چنانچہ علامہ نیمویؒ نے ''آثار السنن'' کی تالیف کا کام شروع کیا اور جرح وتعدیل روات اور فنی مباحث سے

یہ ثابت کر دیا کہ فقہ حنفی کی بنیاد محض قیاس اور رائے پر نہیں؛ بلکہ اس کی اساس قرآن وحدیث ہے۔
علامہ نیمویؒ اس صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں گویا ہیں:

''یہ تو ظاہر ہے کہ حدیث میں پہلے ''بلوغ المرام'' یا ''مشکوۃ شریف'' پڑھائی جاتی ہے اور ان کے مؤلف شافعی المذہب تھے۔ ان کتابوں میں زیادہ تر وہی حدیثیں ہیں جو مذہب امام شافعی کی مؤید اور مذہب حنفی کے خلاف ہیں۔ بیچارے طلبہ، یہ ابتدائی چیزیں پڑھ کر مذہب حنفی سے بدعقیدہ ہو جاتے ہیں۔ پھر جب صحاح ستہ کی نوبت آتی ہے تو ان کے خیالات اور بھی بدل جاتے ہیں۔ علمائے حنفیہ نے کوئی ایسی کتاب قابل ذکر تالیف ہی نہیں کی کہ جس میں مختلف کتب احادیث کی وہ حدیثیں ہوں جن سے مذہب حنفی کی تائید ہوتی ہے۔ آخر بیچارے طلبہ غیر مقلد نہ ہوں تو کیا ہوں۔ فقیر نے انھیں خیالات سے حدیث شریف میں ''آثار السنن'' نامی ایک کتاب تالیف کی ہے''(۱۲)۔

علامہ محمد یوسف بنوریؒ ''الاتحاف لمذھب الاحناف'' میں ان عوامل پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

”وكان رجال من مشتغلين بالحديث نزعت منهم نزعة من الطعن فى أدلة مذهب فقيه الأمة أبى حنيفة رحمه الله بأنها تخالف الأحاديث الصحيحة فاضطر إلى تأليف فى جمع روايات صحيحة توافو مذهب الإمام من مؤلفات خاصة فى الأحكام و سماه آثار السنن“(۱۳).

''علم حدیث سے شغف رکھنے والے کچھ حضرات امام ابوحنیفہؒ پر طعن کرنے لگے کہ یہ صحیح احادیث کے مخالف ہیں، تو ان کو (حضرت نیموی) ان روایات صحیحہ کے جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو خاص طور پر احکام میں امام کے مذہب کے موافق ہوں۔ انھوں نے اس تالیف کا نام آثار السنن رکھا''۔

ذخیرہ کتب حدیث: اس عظیم الشان کتاب کی تالیف کے لیے کتب حدیث، کتب اسماء الرجال اور کتب فقہ کے ایک بڑے ذخیرہ کی ضرورت تھی جسے مآخذ اور مراجع کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ اس لیے علامہ نیمویؒ نے اس کتاب کی تالیف سے پہلے کتابوں کی فراہمی کا کام شروع کیا۔ کتابوں کی فراہمی دقت طلب عمل تھا، اس کے لیے موصوف نے زر کثیر صرف کیے، ہندوستان کے اسفار کیے، اخبارات کے ذریعے منادی کروائی کہ کسی صاحب کے پاس حدیث کا کوئی نایاب قلمی نسخہ ہو تو اس سے مطلع فرمائیں۔ اس تمام تر جدوجہد کا یہ نتیجہ نکلا کہ آپ کے ذاتی کتب خانہ میں حدیث، اصول حدیث، نقد حدیث، فقہ، اصول فقہ اور اسماء الرجال کی اہم کتابیں جمع ہوگئیں۔ اس کے علاوہ چند ایسی

قلمی کتابیں بھی ہاتھ آگئیں جو ہندوستان کیا عرب میں بھی کمیاب تھیں اور ان کے دیکھنے کو اہل علم کی آنکھیں ترستی تھیں (۱۴)۔

اس مساعی جمیلہ کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ آپ کی رسائی ان کتب خانوں تک ہوگئی جہاں نادر ونایاب کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا؛ چنانچہ جب مشہور عالم شیخ سعید بنارسی نے آپ کی تصنیف ''حبل المتین'' کے حوالہ جات پر اعتراضات کیے اور دریافت کیا کہ آپ نے اپنی کتاب میں ''معجم کبیر''، ''مسند راہویہ''، اور ''مسند حمیدی'' کے جو حوالے دیے ہیں وہ آخر کہاں موجود ہیں تو آپ نے انہیں لکھا:

''پنجاب کے شہر بھاولپور میں جناب شمس الدین مرحوم کا نامی کتب خانہ ہے۔ انھیں کے کتب خانے میں معجم کبیر بخط ولایت موجود ہے۔ ہندوستان میں ایک نہیں مسند حمیدی کے تین نسخے ہیں۔ ایک نسخہ مکرمی جناب مولانا مولوی محمد سعید صاحب مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد کے کتب خانہ میں ہے۔ دوسرا نسخہ میرے مکرم دوست جناب مولوی شیخ احمد مکی جن کا اکثر قیام بھوپال میں رہتا ہے ان کے پاس ہے؛ مگر یہ نسخہ پورا نہیں ناقص ہے۔ تیسرا نسخہ شفیقی مولوی عبدالحق صاحب ساکن کرنول ضلع مدراس کے پاس ہے۔ میں نے وہ حدیث اسی کرنول کے نسخے سے نقل کی ہے۔ اس میں بعینہ وہ روایت موجود ہے۔ مسند راہویہ کا اگر آپ کو پتہ نہیں تو مجھ سے سنیے کہ قاہرہ کے کتب خانہ میں یہ کتاب موجود ہے''(۱۵)۔

آخر میں تحدیث نعمت کے طور پر لکھتے ہیں:

''اللہ کے فضل وکرم سے ایسے ایسے نامی کتب خانوں کی اطلاع رکھتا ہوں کہ بڑے بڑے شائقین حدیث کو جن کی خبر تک نہیں اور بے شک میرے لیے بڑا فخر ہے کہ ایسی ایسی نایاب کتابیں نظر سے گذریں ہیں کہ جن کو دیکھنے کو لوگوں کی آنکھیں ترستی رہتی ہیں''(۱۶)۔

آغاز تالیف اور طباعت: علامہ نیمویؒ نے آثار السنن کی تالیف کا آغاز ۱۳۰۶ھ سے کچھ قبل کیا اور مشاغل کی کثرت، نایاب کتابوں کی فراہمی میں دقت اور علائق زمانہ کے باوجود ۱۳۱۳ھ میں کتاب الصلوۃ تک مکمل کردیا۔ صاحبزادہ مولانا عبدالرشید فوقانی ''القول الحسن'' میں لکھتے ہیں:

"إن النيموي قد شرع في كتابه آثار السنن فى السنة السادسة بعد الألف وثلاث مأة من الهجرة النبوية، بل من قبيلها وفرغ من تحرير اخر أبواب الصلاة من ذلك الكتاب فى الثالثة عشر بعد الألف وثلث مأة".

''علامہ نیمویؒ نے اپنی کتاب آثار السنن کی تالیف کا کام ۱۳۰۶ھ سے کچھ قبل شروع کیا اور ابواب الصلوۃ کی تکمیل سے ۱۳۱۳ھ میں فراغت پائی''۔

اگرچہ کتاب الصلوٰۃ تک تالیف کا کام ۱۳۱۳ھ میں مکمل ہوگیا تھا؛ لیکن اس کی طباعت کا شرف پہلی بار ۱۳۲۱ھ میں احسن المطابع عظیم آباد کو حاصل ہوا۔ مولوی عبدالقادر صاحب مالک مکتبہ نے مصنف کی نگرانی میں عابد حسین صاحب سے جلی اور شاندار کتابت کرا کے شائع کرایا تھا۔ اس کی قیمت صرف ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک رکھی گئی تھی؛ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طباعت کے اخراجات بہت حد تک خود مصنف کو برداشت کرنے پڑے اور اتنی رقم نہیں تھی کہ مکمل کتاب الصلوۃ یکبارگی شائع کرائی جاسکے؛ اس لیے علامہ نیمویؒ نے اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ اس بارے میں آپ خود لکھتے ہیں:

''بیشتر مؤلف کا قصد تھا کہ پوری کتاب جلد اول کتاب الصلوٰۃ تک چھپوا کر شائع کی جائے مگر بوجہ کثرت مخارج وقلت مداخل زیورِ طبع کا پورا بندوبست نہ ہوسکا، بعض بعض حضرات خیر اندیشان مذہب نے اس کے طبع میں مالی اعانت بھی فرمائی ہے؛ مگر وہ رقم چند اجزا کے لیے کافی تھی اور اس ضخیم کتاب کے چھپوانے میں زر کثیر درکار ہے؛ اس لیے مؤلف کا قصد ناتمام ہی رہا اور ادھر علمائے زمانہ نے اپنا بے حد اشتیاق ظاہر فرما کر سخت تقاضا شروع کیا، چار و ناچار جلد اول کے دو حصے کرکے اول جس میں اکثر ابواب الصلوۃ اور معرکۃ الآراء مباحث درج ہیں، شائع کیا جاتا ہے''۔

اس کتاب کی تصحیح اور پروف ریڈنگ کا کام بھی علامہ نیمویؒ نے انجام دیا اور ۱۴۵ اغلاط کی فہرست مرتب کرکے اسے کتاب سے منسلک کروایا۔

جز اول کی طباعت کے بعد کافی دنوں تک جز ثانی کی طباعت کی نوبت نہیں آسکی۔ تاخیر کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے خود آپ رقم طراز ہیں:

''دوسرے حصے کے اشتیاق میں برابر خطوط آتے رہے؛ مگر اس کی اشاعت میں حد سے زیادہ تاخیر ہوئی۔ سبب یہ کہ مؤلف امسال مختلف امراض میں بہت بیمار رہا۔ حصہ اول کے جس قدر نسخے فروخت ہوئے ان کی قیمت معالجہ اور ذاتی اخراجات میں صرف ہوتی گئی اور کوئی دوسرا سامان اس کے طبع کا نہ ہوسکا۔ سن گذشتہ میں رئیس ڈھاکہ نے اس کے چھپوا دینے کا وعدہ کیا تھا؛ مگر ایفائے وعدہ کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ غرضے کہ مہینوں میں یہ حصہ عدم سامان زیور طبع کی وجہ سے اور مؤلف کی علالت کے سبب سے پڑا رہا، آخر تحریک بعض اہل فضل وعمائد ارباب دین، حضرات دربھنگہ نے چندہ کرکے اس کے طبع کامل کی اعانت فرمائی، جن کی ہمتِ عالیہ کی وجہ سے آج یہ دوسرا حصہ بھی بفضلہٖ تعالیٰ چھپ کر نظر افروزِ عالم ہوتا ہے''۔

یہ دوسرا حصہ بھی احسن المطابع نے چھاپا تھا، جس میں مصنف نے اکانوے غلطیوں کی فہرست

الگ سے لگوائی تھی، اس حصہ میں علامہ نیمویؒ کی ان تحقیقات کو بھی داخل کردیا گیا تھا جو حصہ اول کی طباعت کے بعد مصنف نے کی تھیں، وہ اغلاط بھی چھوٹے چھوٹے پرزوں میں جگہ جگہ رکھ دیئے گئے جن کا علم مصنف کو طباعت کے بعد ہوا۔

گو یہ ایڈیشن اغلاط سے پاک نہیں؛ لیکن پھر بھی غنیمت ہے۔ اس کے اخیر میں علامہ کشمیریؒ کے دو قصیدے بھی شامل ہیں جو انھوں نے علامہ نیمویؒ کی شان میں کہے تھے۔

قبول عام: ''آثار السنن'' جب زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی تو علمائے کرام نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی تصنیفات اور تالیفات میں اس کے اقتباسات کو قول فیصل کے طور پر نقل کرنے لگے۔ حضرت شاہ عبدالحق مہاجر مکیؒ کو علامہ نیمویؒ نے جب اس کتاب کا نسخہ بھیجا تو آپ بہت مسرور ہوئے اور اجتماعی دعا فرمائی۔

قسطنطنیہ کے مشہور حنفی عالم محمد زاہد کوثریؒ نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قد الف كتابه آثار السنن فى جزئيين لطيفتين و جمع فيهما الأحاديث المتعلقة بالطهارة والصلاة على اختلاف مذاهب الفقهاء و تكلم على كل حديث منها جرحا و تعديلا على طريقة المحدثين و أجاد فيما عمل كل الإجادة"(۱۷).

''انھوں نے اپنی کتاب آثار السنن کو دو حصوں میں تالیف کیا اور اختلاف مذاہب فقہاء کے ساتھ طہارت اور صلوۃ سے متعلق احادیث کو اس میں جمع کیا اور تمام احادیث پر محدثانہ طرز پر جرح وتعدیل کی اور خوب کی''۔

مولانا سید حکیم عبدالحیؒ ''نزہۃ الخواطر'' میں یوں رقم طراز ہیں:

"واشتغل بقرض الشعر مدة طويلة ثم وفق الله سبحانه لخدمة الحديث الزريف فشمر عن ساق الجد واشتغل بالحديث وصنف آثار السنن وهو كتاب نادر غريب".

''وہ مدت دراز تک شاعری میں مشغول رہے، پھر اللہ تعالی نے حدیث شریف کی خدمت کی توفیق بخشی تو کمر ہمت کس لیا اور حدیث میں مشغول ہوگئے اور آثار السنن کی تصنیف کی۔ یہ ایک عجیب وغریب کتاب ہے''۔

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے اس کتاب کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

خالص محدثانہ رنگ میں حنفی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں جو پہلی کتاب لکھی گئی، جہاں تک مجھے معلوم ہے ''آثار السنن'' ہے۔ میری نگاہ میں اس کتاب کی بہت قدر و قیمت ہے اور مولانا ظہیر احسن

شوقؔ کا تصنیفی شاہکار ہے‘‘۔

’’حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اپنی تمام تر عبقریت کے باوجود اس کتاب سے بہت متاثر ہوئے اور اس پر حاشیہ بنام ”الاتحاف لمذهب الاحناف“ لکھا جس کا مفصل تذکرہ ایک مستقل عنوان کے تحت آگے آئے گا۔

اس کے علاوہ حضرت کشمیری کا معمول یہ بھی تھا کہ جو طلبا، دیوبند اور ڈابھیل سے فارغ ہوکر نکلتے تو آپ وصیت فرماتے کہ ہر ایک کے پاس یہ کتاب ہونی چاہیے۔تمام کتب رجال پر’’آثارالسنن‘‘ کو ترجیح دیتے اور فرماتے’’حضرت نیمویؒ کی تحقیق کی داد ہے‘‘۔

مولانا محمد نذیر حسین محدث دہلویؒ فرمایا کرتے تھے:

”إن الأخ النيموى حقق فى بحث الجهر بالتامين ما لم يتحقق أحد من المتقدمين“ .

’’بھائی نیموی نے آمین بالجہر کی تحقیق اس انداز پر کی ہے جس انداز پر متقدمین میں سے کسی نے نہیں کی‘‘۔

مولانا ابوالحسن ندویؒ نے فرمایا:

”تلقى كتابه آثار السنن بالقبول وعنى به علماء هذا الشان“ .

’’ان کی کتاب آثارالسنن مقبول عام ہوئی اور علماء نے اس کی طرف بڑی توجہ دی‘‘۔

ایک دوسری جگہ یوں رقم طراز ہیں:

’’مولانا ظہیراحسن شوق نیمویؒ کی کتاب ’’آثارالسنن‘‘ محدثانہ نقد ونظر اور مذہب حنفی کی تائید میں ایک بلند پایہ تصنیف اور ہندوستان کی فن حدیث کی تصنیفات میں ایک وقیع اور جدید اضافہ ہے‘‘۔

(باقی آئندہ)

❁ ❁ ❁

حواشی

(۷) القول الحسن، ص:۱۵۲۔ (۸) القول الحسن، ص:۱۵۰۔ (۹) آثارالسنن، ص:۱۲۹، ۱۳۰، احسن المطابع عظیم آباد۔

(۱۰) تقدس انور، ص:۳۱۰۔ (۱۱) التحقیق الحسن، ص:۱۷۔ (۱۲) ظہیراحسن النیموی، حیاتہ آثارہ فی الحدیث، ص:۱۸۴۔

(۱۳) مقدمہ اتحاف لمذہب الاحناف للشیخ البنوری۔ (۱۴) القول الحسن، ص:۱۲۔

(۱۵) ردالسکین، بحوالہ انوار مدینہ لاہور، جمادی الثانی ۱۴۱۶ھ۔ (۱۶) ردالسکین۔

(۱۷) مقالات الکوثری، ص:۷۳۔

❁ ❁ ❁

ترکی کے تازہ حالات اوران کا پیغام اورسبق

از: مولانا یحییٰ نعمانی
ناظم: دارالعلوم الصفہ، لکھنؤ

ترکی اپنی عظیم تاریخ اور جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے مسلم ممالک میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے، گذشتہ چند سالوں میں، ترکی نے تقریباً پون صدی کے مذہب بیزار جبریہ نظام کے بعد، خوشگوار تبدیلی کا ذائقہ چکھا ہے اور وہ بظاہر ایک ایسے راستہ پر گامزن ہوا ہے جس کا اہل ایمان کو انتظار تھا، موجودہ صدر رجب طیب اردوگان کے آنے کے بعد ان تبدیلیوں کی رفتار میں تیزی آئی ہے جس کے نتیجے میں ترکی اوراس کے حالات سنجیدہ غور وفکر کا موضوع بنتے جارہے ہیں، پیش نظر مضمون اسی قسم کے غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص مضمون کے ہر لفظ سے اتفاق کرے؛ لیکن موضوع کی دلچسپی اور مضمون کی سنجیدگی کے پیش نظر شائع کیا جارہا ہے۔ (مدیر)

ترکی کے انتخابات میں رجب طیب اردوغان صاحب کی واضح جیت پر عموماً اسلامی حلقوں اور مسلم ممالک میں مسرت واطمینان کا اظہار کیا گیا۔ موجودہ حالات میں امت مسلمہ کے لیے یہ کوئی بڑی کامیابی اور فتح چاہے نہ ہو؛ لیکن بڑی خوشی کی بات ضرور ہے۔ ہم ہزیمت وادبار کے جس دور میں جی رہے ہیں، اس میں کسی اچھی خبر کے لیے مدتوں کان ترستے رہتے ہیں، جب ہر صبح، صبحِ الم اور ہر شام، شامِ غم ہے، تو کچھ عجب نہیں جو چھوٹی سی کامیابی امید کے چراغ روشن کرنے لگے یا بادِ نسیم کا ہلکا سا جھونکا سازِ دل کے تار چھیڑ دے اور بلبل نغمہ سنج ہو اٹھے۔ مسلسل شکست وریخت اور بربادیوں کے ہجوم سے دل رنجور اور جسم چور ہیں۔ ہر کس وناکس مشق ستم کے لیے تیار ہے۔ دوسرے تو کیوں رحم کھاتے؟ اپنوں نے ہی ظلم واستبداد کی زنجیروں میں ملکوں اور قوموں کو کسا ہوا ہے۔ اور دشمنوں کی گودوں میں بیٹھ بیٹھ ہمارے زخموں پر نمک پاشی کی ہے۔ پھر کیوں نہ کسی ایسے کو دیکھ کے آنکھیں ٹھنڈی ہوں جو دشمنوں کی آنکھ کا کانٹا ہے اور جہد للبقاء میں ثابت قدم وظفریاب ہے۔

صرف خوشی ومبارک باد دینے کے بجائے، آج کی مجلس میں ہم اُس کامیابی کی اصل نوعیت جاننے اوراس سے اپنے لیے سبق ونمونہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جو ترکی کے عوام، ''جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی'' اور بلاشبہ اس کے زبردست قائد اردوغان صاحب نے، ان کے پیشرو دین کے داعیوں اور سیاست اور سماج میں جد وجہد سے چمٹے رہنے والے اہل صبر وعزیمت اور اہل ایمان وحکمت مجاہدانِ ملتِ ترک نے حاصل کی ہے۔

یہ ایک بڑی چشم کشا وسبق آموز داستان ہے، اس میں عصر حاضر کے چیلنجز اور امت مسلمہ کی کمزور پوزیشن کے مطابق راہ عمل کی بہترین نشاندہی ہے۔ اس میں سبق ہے کہ ممکنہ مواقع چاہے کتنے چھوٹے اور حق وحریت کے حصول کے امکانات چاہے کتنے معمولی ہی کیوں نہ ہوں ان کو استعمال کرنا اور وہیں سے کام شروع کرنا ہی کامیابی اور ظلم واستبداد سے نجات کا واحد راستہ ہے۔ نہ امکانات کو چھوڑ دینا راستہ ہے اور نہ امکانات اور مواقع سے زیادہ کی کوششیں نتیجہ خیز طریقہ ہے۔ یہی دانائی وحکمت کا تقاضہ ہے اور یہی سنت رسول کی بصیرت۔

ترکی، ظالم عالمی طاقتوں کے منصوبہ اور پروجیکٹ کا مکمل نمونہ تھا۔ پہلے مالیاتی سازشوں سے اس کی معاشیات کی کمر توڑی گئی۔ اس کو اپنے دشمنوں کا دست نگر بنایا گیا۔ اس پر کمال اتاترک اور اس کی ''اتحاد وترقی پارٹی'' کے دونمہ یہودی اور منافق حکمراں مسلط کیے گئے۔ عام مسلم قوموں کی طرح دینی واخلاقی کمزوری کا شکار ترکی معاشرہ دوست ودشمن اور نفع ونقصان کی سمجھ کھو چکا تھا، اس کے پاس ان زبردست سازشوں کے مقابلے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ اصول واخلاق اور دین وملت کے بجائے وہ مادی ''ترقی'' اور نیشنلسٹ ''اتحاد'' کے سراب کے پیچھے بھاگ پڑا۔ پھر جو ہوا اس سے آپ واقف ہیں۔ پوری قوم کو غلام اور مرتد بنانے کا عمل تیزی سے کیا گیا اور جبر واستبداد کے شکنجوں سے کام لیا جانا شروع ہوا۔ مسجدیں بند، اذانیں موقوف، دینی حلیہ جرم اور قرآن کی تعلیم ممنوع قرار دی گئی۔ ترکی زبان کے ریشے ریشے میں اسلامیت کا نم تھا، اپنی اسلامی جڑوں سے اس کو کاٹنے کے لیے بالجبر اس کا رسم الخط لاطینی کروایا گیا۔ مغرب نے اپنے لیے جمہوری نظام اور عوام کی آزادی کو جس قدر پسند کیا ہے، اس نے اس سے کہیں زیادہ اس کا اہتمام کیا ہے کہ مسلم ممالک میں کہیں بھی وہ پنپ نہ سکے۔ ترکی اس کا بھی ایک نمونہ تھا۔ اسلام دشمن اور منافق عناصر کو ملک کی تمام بااثر پوزیشنوں پر معین کیا گیا، خاص طور سے اس کا اہتمام کیا گیا کہ ملک میں ایک طاقت ور فوج ہو، وہ اسلام دشمن ہو اور اس کے ہر بیج کو کچلنے کے لیے ہر دم مستعد رہے۔

دو نسلیں نہیں گزریں تھی کہ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس جبری کفر کے تسلط سے ترکی تہذیبی طور پر مکمل مغربی ملک بن گیا، جس میں اسلامیت خاکستر کی چنگاری کی طرح تھی، مگر دبی اور چھپی تھی۔عوام شریعت کی پابندیوں سے آزاد اور مغربی طرزِ بود وماند کے عادی ہوگئے۔اور اس بات کا حقیقی ڈر تھا کہ یہ صورت حال زیادہ دن باقی رہ گئی تو ملتِ ترک کا رشتہ اسلام سے بالکل ہی کٹ جائے گا۔

ان حالات میں ترکی کے مخلصان اسلام نے کام شروع کیا۔

(۱) انھوں نے دوسری اسلامی اقوام کے برخلاف اس نوشتۂ دیوار کو پڑھنے میں دیر نہیں لگائی کہ قوم عملاً اسلام سے دور ہو چکی ہے۔ایمان ویقین کے بجائے دین کے صرف رسمی مظاہر بچے ہیں، نظام تعلیم، ذرائع ابلاغ اور مغرب کے بین الاقوامی غلبے نے مسلمانوں کی اکثریت کو شدت سے متاثر کیا ہے۔ یہ وقت کسی ہمہ گیر مکمل اسلامی ریاست کے قیام کے لیے انقلابی تحریکیں چلانے کا نہیں ہے۔ بلکہ قوم کے ایمان کو بچانے کا ہے۔اس لیے کہ جب آپ کی قوم کی اکثریت ایسے کسی انقلاب کو اپنے اوپر عملاً نافذ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تو آپ کس بودگی پر ظلم وجبر کی قوتوں کا مقابلہ کریں گے۔ ہر مسلم ملک میں مغربی طرز کی آزاد زندگی اور لادینی فکر وخیال کے لوگ ہی معاشروں میں قیادت ورہنمائی کے مراکز پر قابض ہیں، خصوصاً نوجوان نسل کا فکری قبلہ مکہ وحجاز کے بجائے کب کا لندن وپیرس بن چکا ہے۔ یونیورسٹیوں سے لے کر اخبارات تک ہر طرف انھی کی دعوت کا شور اور انھی کے کلچر کی تبلیغ ہے۔

(۲) انھوں نے ایک دوسری حقیقت کو بھی محسوس کیا اور سمجھ لیا۔اگر چہ وہ عریاں سامنے کھڑی تھی مگر دوسرے لوگ اپنی جذباتیت اور رومانویت کی وجہ سے اسے دیکھنے سے منہ چراتے رہے۔یعنی یہ کہ مسلم معاشرے اندر سے کھوکھلے ہو چکے ہیں۔اخلاقی قوت دم توڑ چکی ہے۔اتحاد پارہ پارہ ہے۔ نفاق ومکر اور ضمیر فروشی نے ان کو مغرب کی مضبوط اقوام، برق نما (Dynamic) ذہانتوں اور منظّم حکومتوں سے دوبدو کشمکش کے لائق نہیں چھوڑا ہے۔ بین الاقوامی خفیہ ایجنسیوں نے اقتدار وحکومت کے تمام مراکز کو اندر سے اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔حکمراں طبقہ یہاں تک کہ افواج تک ایجنٹوں سے بھرے ہوئے ہیں۔جس کی وجہ سے اسلامی ممالک میں کہیں سیاسی استحکام نہیں ہے۔اس لیے انھوں نے طے کیا کہ یہ وقت زور آزمائی کا نہیں، قوم کی تعمیر نو کا ہے۔

لہٰذا انھوں نے سب سے پہلے اپنی کل توجہ قوم میں پھر سے اسلام پر یقین، اور اس سے محبت پیدا کرنے پر لگائی۔اس طرز وطریق کے بانی ترکی کے مردِ مجاہد شیخ بدیع الزمان سعید نورسی تھے۔

انھوں نے اپنے حالات کے لحاظ کرتے ہوئے حکمراں طبقات کے ساتھ مزاحمت سے کلی پرہیز کیا۔ ان کو قید و بند اور جلا وطنی کی پے بہ پے صعوبتیں اٹھانی پڑیں، مگر انھوں نے اپنے رسائل اور تربیتی حلقوں کے ذریعے ایک خاموش دینی انقلاب کی بنیاد رکھ دی۔ جو سیلاب کی طرح نہیں، مدھم پھوار اور شبنم کی طرح گل و لالہ کو سیراب کرتا رہا۔

مشہور نومسلم امریکی دانشور محترم مریم جمیلہ نے اب سے ۵۳ سال پہلے شیخ نورسی کی تحریک اور دوسری اسلامی تحریکوں کے مقابلے اس کی کامیابی کے راز کو بیان کیا تھا۔ ایک امریکی جریدے کو لکھے گئے خط میں وہ لکھتی ہیں:

بدیع الزماں نورسی کی طاقت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انھوں نے اپنی مشکلات اور مجبوریوں کو سمجھ لیا تھا، اور مسلمان جن حالات میں مبتلا ہیں ان کا حقیقت پسندانہ اندازہ کر لیا تھا، انھوں نے احیائے اسلام کے دوسرے مسلمان راہنماوں کی طرح اسلام کے عالمگیر سیاسی، معاشی اور سماجی نظام کے شاندار منصوبے تیار نہیں کیے، جن پر عمل کرنے کا مستقبل قریب میں اس وقت تک کوئی امکان نہیں جب تک کہ نام نہاد مسلمان حکمرانوں کی اکثریت اہل ایمان کو بے رحمی کے ساتھ کچلتی رہے گی، اور جب تک موجودہ سماجی خرابیاں، اجنبی اور ملحدانہ نظام تعلیم اور دیگر ذرائع ابلاغ، جن کے نقصاندہ اثرات سے والدین کو اپنے معصوم بچوں کو بچانا بھی ممکن نہیں، ختم نہ ہو جائیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ آج ایک بھی ریاست ایسی نہیں جس کو اسلامی کہا جاسکے، کوئی قوم، کوئی گروہ، حتی کہ ایک خاندان بھی ایسا نہیں ہے جس کو پوری طرح مسلمان کہا جا سکے۔

جب مسلمان نوجوانوں کی اکثریت نے اسلام پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہو، اور مغربیت کو ذوق وشوق سے اور بغیر کسی تنقید کے اندھوں کی طرح قبول کر رہے ہوں تو ایسی صورت میں متحدہ اسلامی دنیا، اسلامی بلاک، اور اسلامی اتحاد کی بات کرنا بے معنی ہے۔ بدیع الزماں صاحب کی صاحب بصیرت نگاہ نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ایسے ماحول میں عملی سیاست میں حصہ لینا کار عبث اور بے نتیجہ ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ صرف سیاسی قوت حاصل کر لینے سے اسلام کا احیا نہیں ہوسکتا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سیاسی انقلاب، اسلامی انقلاب کا راستہ نہیں ہے، کیوں کہ ایسے اسلامی انقلاب کو جوابی انقلاب کے ذریعہ ناکام بنایا جاسکتا ہے، اور اس کشمکش کا نتیجہ مزید تشدد اور جبر و استبداد ہوگا۔ لہٰذا:

انھوں نے دانشمندی سے کام لے کر ایک سخت، بے لچک تنظیم قائم کرنے سے احتراز کیا، کیوں کہ اس قسم کی تنظیم پر ایک صاحب اقتدار آمر آسانی سے پابندی لگا سکتا ہے، اس کے راہ نماؤں کو قید کرسکتا ہے، اوران کو پھانسی دے سکتا ہے۔ ایسی تنظیم کے دفتروں کو سر بمہر کیا جاسکتا ہے، اور اس کے لٹریچر کو ممنوع قرار دیا جاسکتا ہے، سعید نورسی نے اس کے برخلاف تبلیغ واشاعت اور اپنی کتابوں کے ذریعہ ہزاروں ترکوں کے دلوں میں ایمان کی جڑیں مضبوط کردیں۔ یہ ایسی تحریک تھی جس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی تھی، اور ایک ظالم ترین استبداد بھی اس کی تعلیمات کو پھیلنے سے نہیں روک سکتا تھا۔

نورسی تحریک کا طریق کار ایک استبدادی نظام کے تحت، جو مسلمان ملکوں کا مقدر بن چکا ہے، زندگی گزارنے والے مختلف طبقوں کے لوگوں میں کام کرنے کے لیے انتہائی موزوں ہے، دوسرے ملکوں کی اسلامی تحریکوں کے برخلاف اس نے مخالفانہ ماحول میں پروان چڑھنے کی صلاحیت ثابت کردی ہے۔ اس دعوے میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ آج ترکی میں جو کچھ اسلام باقی ہے بدیع الزماں سعید نورسی کی انتھک اور بے لوث جدوجہد کا نتیجہ ہے، انھوں نے اس بات کا احساس کرلیا تھا کہ جدید دور کے انسان کی سب سے بڑی ضرورت اس میں اخلاقی وروحانی بیداری پیدا کرنا ہے، اور یہ کہ نوجوانوں کو دوسری تمام چیزوں سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ان کے اندازِ فکر کو مادہ پرستی سے روحانیت کی طرف موڑ دیا جائے، رسائل نور اسی مقصد کے لیے وقف ہیں، دوسری اسلامی تحریکوں کے مقابلے میں جن کو یا تو صاحب اقتدار لوگوں نے دبا دیا یا وہ بے حرکت اور غیر موثر بن گئیں اس نورسی تحریک نے اللہ تعالیٰ کی مدد سے محیر العقول کامیابی حاصل کی ہے''

ماخوذ از: ترکی کا مردِ مجاہد، از: ثروت صولت، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی

اس تحریر کی خاص اہمیت یہ ہے کہ مریم جمیلہ صاحبہ جماعت اسلامی اور اخوان المسلمین کی تحریک سے بہت واقف اور ان کی قیادتوں سے بہت مربوط تھیں۔ جب کسی کو ترکی کی اس تحریک ودعوت کی کامیابی کے معیار اور تاثیر کی قوت کا اندازہ نہیں تھا، مریم جمیلہ اس کو ایک زیادہ کامیاب، بااثر اور نتیجہ خیز نمونے کے طور پر دیکھ رہی تھیں۔

شیخ بدیع الزماں سعید نورسی کے طریق کار میں ''شکوہِ ترک مانی'' تو نہیں تھا، مگر، کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ''ذہنِ ہندی'' ضرور تھا۔ ترکی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا سلسلۂ تصوف (عموما

حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کے واسطے سے) عام تھا، وہی گویا روحانی مرکز اور سرچشمہ تھا اور مکتوبات مجددیہ ہی (جوتجدید واحیاء دین کی حکمت سے معمور اور سلوک وارشاد کا پورا نصاب ہیں) دینی و روحانی فکر کی اساس تھے۔ رسائل نور ہمارے ان مشائخ کی حکمت سے بھرے پڑے ہیں۔

حضرت مجدد صاحبؒ کے دور میں بھی حکمراں اکبر بزور طاقت کفر مسلط کرنے پر آمادہ تھا۔ تفصیل کا موقعہ نہیں مگر مختصر یہ کہ ملک ارتداد کے خطرے سے دوچار تھا۔ کافری عزت مند اور مسلمانی ذلیل ہورہی تھی۔ حضرت مجدد صاحب نے نہ بادشاہ کی تکفیر کی۔ نہ بغاوت کے امکانات پائے۔ بس خاموش اور تاریخ کی ایک منفرد کوشش میں مشغول ہوگئے۔ ان کے مکتوبات نے وہ کام کیا جو لشکر نہیں کرسکتے۔ کچھ بعید نہیں کہ حضرتِ مجددؒ کے اسی نمونے کو سامنے رکھ کر شیخ بدیع الزماں نورسیؒ نے مکتوبات ورسائل ہی کو اپنا ذریعہ بنایا ہو۔ جن کی قلمی کاپیاں تیار کی جاتیں اور ملک میں پھیلائی جاتیں تھیں۔ اور انہی سے دین کے داعی اور ملت میں استقامت کے حاملین تیار کیے جاتے رہے۔

خیر! وقت گزرتا رہا اور دھیرے دھیرے ترکی ایک خاموش ذہنی انقلاب کی طرف بڑھتا رہا، جس کو دین دشمن فوج اور کمالی حکمراں بھی روک نہیں سکے۔ لیکن دینی سرگرمیوں پر پابندیاں برقرار رہیں۔ اہل دین اپنی کمزور پوزیشن سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ یورپ کے دروازے پر ہیں۔ بین الاقوامی طاقتیں ان کے معاملے میں شدید حساس ہیں۔ تاریخ نے ان کے ان خدشات کو یقین اور تجربے میں بدل دیا تھا۔ مگر وہ احتیاط کے ساتھ تعلیم وتربیت کا کام کرتے رہے۔

ان حالات میں اردوغان صاحب نے قوم کے سامنے ایک نیا سیاسی تجربہ رکھا۔ وہ جانتے ہیں کہ ترکی میں ایک بڑی تعداد آزاد خیال لبرلس کی ہے جو سیاست اور ملکی قوانین میں اسلام کو قبول کرنے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں ہے۔ اس کی تعلیم جس نظام ونصاب سے اور تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے اس نے اس کی ذہنی ساخت ایسی بنادی ہے کہ وہ خالص متشرّع قسم کی حکومت اور ٹھیٹھ اسلامی نظام زندگی سے متنفر ہے۔ اور آج بھی اس نصاب ونظام اور میڈیا میں کوئی بڑی تبدیلی ناممکن ہے۔ اس لیے ان کی جماعت نے اپنے دینی رجحانات کو قطعاً نہ چھپاتے ہوئے بھی، صاف اعلان کیا کہ ان کا سیاسی ایجنڈا نہ اسلامی حکومت کا قیام ہے، نہ خلافت کا احیا، نہ پین اسلامزم کا نعرہ اور نہ جہاد وشہادت کی منزلیں۔ بلکہ وہ موجودہ ترکی کے سیکولر ڈھانچے اور دستور کے اندر رہتے ہوئے ایک ایسا ترکی قائم کرنا چاہتے ہیں، جہاں عدل وانصاف، معتدل معیشت، خوشحالی اور لازمی طور پر مذہبی آزادی ہو۔

انھوں نے اس مرحلے میں یہی حکمت عملی ضروری سمجھی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: وقت کے معروضی

حالات، خصوصاً بین الاقوامی طاقتوں کی سطوت وقوت، ان کا معاشی تسلط، اور داخلی نفوذ اور اپنی قوم کی ذہنی ومزاجی رجحانات اور اس کے متنوع طبقوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، جتنا ممکن ہو بس اتنا ہی کرنے کے منصوبے بنائے جائیں۔ اس طرح انھوں نے اپنی قوم کے ان طبقات کو بھی ساتھ میں لینے میں کامیابی حاصل کرلی جوان سے متفق تو نہیں تھے، مگر استبداد وجبر کے حامی بھی نہیں تھے۔

دوسری طرف انھوں نے ایک مختصر مدت میں اپنے لائق وفائق رفقاء اور پارٹی کے کیڈر کے ذریعے ملک کو ترقی کی نئی منزلوں تک پہنچایا۔ اقتصادی طور پر ترکی تیز ترین رفتار سے ترقی کررہا ہے، اور اس کی یہ ترقی نچلی سطحوں پر بھی اس طرح نظر آرہی ہے کہ ترکی میں بھلے ہی دنیا کے سرفہرست مال دار شہزادے اور تاجر خاندان نہ ہوں، لیکن نچلی سطح پر خوش حالی میں اضافے کو تمام بین الاقوامی مالیاتی اداروں نے تسلیم کیا ہے۔ نظم ونسق مغربی ممالک کے معیار پر ہے۔ عوامی بہبود وفلاح اور صحت ورفاہ عامہ میں وہ بلاشبہ ہر مسلم ملک بلکہ تمام غیر ترقی یافتہ ممالک سے فائق ہے۔ اس وقت انقرہ میں یورپ کا سب سے بڑا عوامی ہسپتال زیر تعمیر ہے جس میں تقریبا ۴۰۰۰ بستروں کا انتظام ہوگا۔ تعلیم کے شعبے میں ترکش یونیورسٹیاں اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے یورپ کے طلبہ کے لیے بھی باعث کشش بن چکی ہیں۔ غرض ان لوگوں نے ثابت کیا کہ وہ محض اس لیے اقتدار نہیں چاہتے کہ وہ اسلام پسند ہیں اور اس لیے مسند اقتدار پر ان کے علاوہ کسی اور کی جگہ نہیں۔ بلکہ انھوں نے ثابت کیا کہ وہ ملک میں بہتر نظام، اور ترقی پذیر زندگی کی قیادت کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ دوسروں سے زیادہ امین بھی ہیں اور کہیں فائق صلاحیتوں کے مالک بھی۔

اس طرح ترکی ایک ایسا ملک بن سکا جہاں اب اسلام پر عمل اور اس کی دعوت کا استقبال ہے۔ مسجدیں اور قرآنی حلقے آباد ہیں۔ داعیان دین کے لیے کھلے امکانات ہیں۔ عوام میں دینی رجحان بڑھ رہا ہے۔ سیاسی طور پر اس نے ایک بین الاقوامی وزن حاصل کیا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں وہ طاقت کا توازن پیدا کرنے کا ذریعہ بنا ہے۔ مسلم ممالک کے منافقانہ رویے کے درمیان اس کے حکمراں فلسطین کے مسئلے میں جرأت کے ساتھ علم حق بلند کرتے ہیں۔

اس حقیقت کو پاکستان کے بزرگ عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بہت پہلے ہی اچھی طرح محسوس کیا اور ایک خطاب میں رجب طیب اردگان اور ان کی پارٹی کی حکمت عملی کی نہایت تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

اس پارٹی نے اسلام کا نام نہیں لیا، اسلام کے نام کے نعرے نہیں لگائے، جلسے جلوس اسلام

کے نام پر نہیں کیے، کام سارے اسلام کے کیے، سب سے پہلے تو انھوں نے یہ کیا کہ لوگوں کو ان کی زندگی میں سہولتیں پیدا کیں، جو مصیبت آئی ہوئی تھیں معاشی تباہی و بربادی کی، بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، ترقی ملک کی رکی ہوئی تھی، پسماندہ ملک بن گیا تھا اس نے اپنے شہروں کو ترقی دینا شروع کی، لوگوں کو شہری سہولتیں فراہم کیں،.... لوگ بہت خوش تھے، اور بلدیاتی حکومتوں سے بہت خوش تھے، سڑکیں بنالی تھیں، ہوٹل اچھے بنالیے تھے، تفریح گاہیں بنالی تھیں، اس میں مسجدوں کی تعمیر کا بھی کچھ کام کروالیا تھا.... حکمت سے، اس طریقے سے کام کیا، بلدیاتی انتخاب میں جب دیندار لوگوں کی حکومت کا یہ انداز لوگوں نے دیکھا تو جو مرکزی حکومت کے ملکی سطح پر انتخابات ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ لوگ جو دیندار لوگ تھے برسر اقتدار آگئے، اور آج کل وہی برسر اقتدار ہیں،.... صورت شکل سے کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ عرب ہیں، ترکی ہیں یا انگریز ہیں، داڑھی صاف ہے، وہی کوٹ پتلون لباس ہے، لیکن کام وہ اللہ والوں کا کر رہے ہیں، وہاں کے لوگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ یہ لوگ اعلیٰ درجہ کے ولی اللہ ہیں، صدر اور وزیر اعظم اور وزیر خارجہ دین کا کام کر رہے ہیں۔

غور طلب نقطہ یہ ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب تمام اسلامی ممالک میں دینی کوششیں کمزور پڑتی جارہی ہیں، حکومتوں کا نفاق اور اہل دین پر ظلم وستم بڑھتا جارہا ہے۔ ترکی کیوں کر ایک مختلف منظر پیش کر رہا ہے۔ یہی وہ قیمتی سبق ہے جس سے موجودہ مشکلات کے حل کی راہ نظر آتی ہے۔

(۱) اس کی سب سے پہلی اور بنیادی وجہ ان حضرات کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اور Practical Approach ہے۔ ان کے پیش نظر دو حقیقتیں رہی ہیں:

(الف) پہلی یہ کہ ترکی مکمل طور پر ایک آزاد ملک نہیں ہے، دیگر مسلم ممالک کی طرح اس میں مغربی ممالک کی ایجنسیوں کا نفوذ اور مضبوط پکڑ ہے، فوج اور مقتدرہ میں غیر اسلامی عناصر بہت طاقتور ہیں۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اس وقت کا پہلا کام صرف اتنا ہے کہ ترکی میں آزادی، عدل، اور شفاف سیاسی نظام قائم ہو۔ ملک کو فوج کے تسلط سے آزاد کیا جائے۔ قومی ادارے مستحکم اور آزاد ہوں۔ اس کے برخلاف معاصر مسلم تحریکوں نے امت مسلمہ کے انتشار اور مسلم ممالک کی ہمہ جہتی کمزوریوں کا اندازہ لگانے میں بہت غلطی کی ہے۔ ان کو اپنے ممالک میں مغربی ایجنسیوں کے نفوذ اور طاقت کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ ہمارے علماء اور اہل دین کے لیے یہ بہت سبق آموز پہلو ہے۔ یہی ترکی جس میں ''عدالت

وترقی پارٹی'' نے زبردست کامیابی حاصل کی اور جو سالہا سال سے ایک مضبوط گہری سیاسی بنیاد رکھتی ہے، اسی ترکی کے ''اندر سے کمزور'' ہونے اور اس میں ''دوسروں'' کی طاقت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ فوج نے جب بغاوت کی تو پتہ چلا کہ آدھی فوج کسی اور کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھی اور اس کی وفاداری پر یقین نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انقلاب تو آہی چکا تھا، بس ذرا سا بچ گیا۔ یہ تو ہمارے ممالک کی کمزوری کا حال ہے کہ آپ کی فوج ہی آپ کی نہیں۔ کیا ایسے ممالک کو آزاد کہا جاسکتا ہے؟ کیا کسی مغربی ملک میں اس کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ اور جو آزاد نہ ہو وہ آزاد ہونے سے پہلے اگر آزادی برتنے لگتا ہے تو سزا بھی پاکر رہتا ہے۔ ''ترکِ دانا'' نے اس حقیقت کو تسلیم کرکے کام کی حکمت عملی بنائی ہے۔

حقیقت پسندی کے اس طرز کے علاوہ کوئی راستہ ہمارے لیے نہیں ہے، کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم ممالک اندر سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مسلم ممالک کو آزاد سمجھنا پرلے درجے کی سادگی وناواقفی ہے۔ مغربی ایجنسیوں نے ہر ملک اور اس کے ہر ادارے میں پکڑ بنا رکھی ہے۔ ہمارے ملکوں کے تخت پلٹنا، کرسیاں الٹنا، حکم رانوں کے قتل اور فوجی انقلابات ان کے لیے کوئی ناممکن کام نہیں ہیں۔ تو پھر مسلم ممالک کے لیے پہلا کام یہ ہے کہ وہ عوام کے تمام طبقات کو ساتھ لے کر اور (Common Minimum Programme) بنا کر اپنے آپ کو آزاد اور مستحکم کریں۔ پھر کچھ اور سوچیں۔ جب تک مسلم ممالک داخلی طور پر مستحکم اور ان کے ریاستی ادارے، مثلاً فوج، عدلیہ، خفیہ ایجنسیاں، سیاسی جماعتیں اور پالیسی ساز ادارے مضبوط، آزاد اور دنیا کی بڑی طاقتوں اور خصوصاً ان کی ایجنسیوں کے نفوذ سے محفوظ نہیں ہو جاتے یہ ممالک (آج کی طرح) مسلسل شکست وریخت کے شکار رہیں گے، ان کے وسائل دوسروں کی قوت وشوکت میں اضافے کا ذریعہ بنتے رہیں گے اور اس وقت تک نہ ان ممالک میں آزادی آسکتی ہے نہ دینی جدوجہد کو سلامتی مل سکتی ہے۔ اس لیے کام کی فطری اور لازمی ترتیب یہی ہے کہ مسلم ممالک میں اہل دین تمام طبقات کو ساتھ لے کر پہلے اندرونی آزادی اور استحکام حاصل کریں۔ اس کے بعد حکومت وسیاست میں دینی رنگ شامل کرنے کے مرحلے کے بارے میں سوچیں۔ اس فطری ترتیب کو نظر انداز کرنا وہ مہلک غلطی ہے جس نے ہمارا بڑا خانہ خراب کیا ہے۔

(ب) ان حضرات نے دوسری یہ حقیقت سامنے رکھی کہ برسہا برس کی غفلت کا نتیجہ یہ ہے کہ خود ترک معاشرے میں (دیگر مسلم ممالک کی طرح) اسلام کے حوالے سے زبردست فکری انتشار ہے۔ مغربی طرز تعلیم نے اس کی بڑی تعداد کو مغربی تہذیب وطرز کا عاشق اور مادی افکار کا اسیر بنا دیا ہے۔ اس

لیے اگر ہم نے ان طبقات کو جو، چاہے ایمانی واعتقادی خلل اور کمزوریوں کے شکار ہیں مگر، بہر حال مسلمان ہیں، نظر انداز کیا اور ملک میں اپنے فکر کے مطابق ہی چلنا چاہا تو ''غیر'' اور ''دشمن'' ان کو طبقوں کو ہمارے خلاف استعمال کرلے گا، اور ترکی اس داخلی کشمکش سے کبھی بھی آزاد نہیں ہو پائے گا۔

یہ عصر حاضر کے حالات کا نہایت اہم پہلو ہے۔ جب مسلم ممالک میں زبردست فکری وذہنی انتشار ہے۔ مغربی استعمار اور پھر مغربی تعلیم نے خود ہمارے عوام کو دینی تحریکوں سے نفور کر رکھا ہے۔ وہ اگرچہ عقیدے کے مسلمان ہوں مگر عملی طور پر شرعی زندگی گزارنے کو تیار نہیں، ایسی صورت حال میں اہل دین جب سیاست کے مقابلوں میں دوسرے مسلمانوں کے حریف بن کر سامنے آتے ہیں اور کرسیِ اقتدار کو چھیننے کے لیے الیکشنی مقابلے ہوتے ہیں تو وہ اپنے ساتھ دین کو بھی دیگر مسلم طبقات کا، خواہی نخواہی، حریف اور (معاذ اللہ) دشمن بنا دیتے ہیں۔ یہ کیسا خطرناک معاملہ ہے؟ دین کبھی اس پوزیشن کو قبول نہیں کرسکتا کہ اس کے داعی وحامل خود مسلمانوں کے حریف بن جائیں اور اقتدار کی دوڑ میں دیگر مسلم گروہوں سے مسابقت میں مبتلا ہوں۔ کاش مسلم ممالک کے اہل دین اس پر غور کرتے۔ آپ دین کا نام لے کر اقتدار کی دوڑ میں دیگر مسلمان پارٹیوں اور طبقات سے مقابلہ کریں گے تو اُن پارٹیوں اور ان کے زیر اثر مسلمانوں کو اسلام سے دور اور اس کے داعیوں اور حاملوں کا مقابل ودشمن بنائیں گے۔ اس سے بڑا اور کیا نقصان دین ودعوت کا ہوسکتا ہے؟

محترمانِ من! اقامت دین کا راستہ یہ نہیں ہے۔ راستہ یہ ہے کہ آپ قوم میں دین کو ایسا محبوب بنا دیں، اور عملی دین داری کی ایسی ہوا چلا دیں کہ تمام گروہ دین کی رعایت کرنا ضروری سمجھیں۔ اور اہل دین کی دینی کوششوں اور محنتوں میں تعاون کریں۔ اس طرح یقیناً اللہ چاہے گا تو وہ وقت ضرور آئے گا جب پوری قوم مکمل اسلام کو گلے لگائے گی۔ اور اس کی شریعت کی بالادستی قائم ہونے میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔

(۲) دوسرا ایک سبق یہ ہے، اور خصوصاً ملت اسلامیۂ ہند کے لیے بھی: ہم دیکھ رہے ہیں کہ ترک معاشرے کی سیاسی ومعاشرتی قیادت دین سے ہمدردی اور عملی تعلق رکھنے والی ایک جدید تعلیم یافتہ نسل کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا علماء ومشائخ سے تعلق ہے اور وہ بھی اس کی مثبت دینی صفات کی قدر افزائی کرتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ رسمی دینی حلقہ ہی سیاست وتمدن کے تمام شعبوں میں ملت کی نمائندگی کرتا نظر آئے۔

کیوں ایسا نہیں ہے کہ ہمارے سیاسی وتمدنی مسائل کے لیے عام مسلمانوں میں سے لوگ ایک نہایت شریفانہ تربیت پاکر سامنے آئیں، جن کا اہل دین سے حسن ظن اور دینی استفادے کا تعلق ہو۔

مگر وہ عام دین سے دور مسلمانوں اور غیر مسلم حلقوں میں رسائی اور پذیرائی رکھتے ہوں۔ ترکی کے مشائخ نے یہی کام کیا ہے۔

ہمارے یہاں جدید تعلیم یافتہ طبقے سے مسلمانوں کو جو قیادت ورہنمائی، ملّی مزاحمت میں رفاقت اور سرد وگرم حالات میں ہم سازی ملنی چاہیے، عموماً نہیں ملتی۔ یہ ملت کی بڑی محرومی ہے کہ ہمارے جو لوگ جدید دنیا کے آلات ووسائل سے لیس اور اس کے مزاج ومذاق کے مطابق جدوجہد کی اہلیت رکھتے ہیں، ملت ان کی خدمات سے بڑی حد تک محروم ہے۔ علم جدید کے دائرے کے کچھ لوگ میدان میں آتے بھی ہیں تو پہلا کام دین کے مسلّمات میں کتر بیونت اور مشق اجتہاد فرمانے کا کرنے لگتے ہیں! کچھ محترم دانشوروں کی تعداد ضرور اس سے مستثنیٰ ہے، مگر عموماً سب کام علماء اور دینی رہنمائی کے کام کے لوگوں کے ہی حصے میں آتا ہے۔ اس کے اسباب چاہے جو ہوں، مگر یہ صورت حال ہم کو کمزور ثابت کر رہی ہے۔ ملک میں قانونی ودستوری کوششیں ہوں یا غیر مسلم سماجی اور سیاسی گروہوں سے مکالمہ، یا مشترکہ مقاصد کے لیے ان کے ساتھ جدوجہد، سب کام علماء ہی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری درجے کی بات ہے کہ مسلمانوں میں عصری تعلیم کے فروغ کی کوششوں کا بیڑہ بھی اس طبقے نے ہی اٹھایا ہوا ہے۔ یہ بڑی نااہلی اور بے عملی کی بات ہے۔ موجودہ ملت ترک ہم کو اپنی اس کمی کا شدت سے احساس دلاتی ہے۔ کاش جلد یہ صورت حال تبدیل ہو۔

(۳) تیسری ایک نہایت اہم وجہ اور ہے۔ ترکی کی قوم ایک بہتر اخلاقی شعور ومعیار کی حامل ہے۔ وہاں قیادتوں کی سطح پر اس طرح ضمیر فروشی اور ذلیل کردار نہیں ہے جیسا دوسرے ممالک میں بار بار نظر آتا رہا ہے۔ دشمنوں کو ہر سازش کے لیے سیاسی قوتوں بلکہ دینی قیادتوں تک میں افراد مل جاتے ہیں۔ مصر میں ہزاروں نہتھے عوام کے خون سے رنگین جو انقلاب آیا جس نے جمہوریت کو قتل کیا اور آزادیوں کو دفن۔ اس کی پذیرائی کے لیے ازہر کا فتویٰ بھی تھا اور سلفی جماعت حزب النور کی تائید بھی۔ اور پھر بے شرمی کی حد کہ اسلامی دلائل کے ساتھ۔ یہ بے غیرتی! وہ بھی جبہ ودستار کے ساتھ؟؟

اس کے برخلاف ترکی کا حال ابھی نظر آیا ہے۔ حالیہ انتخابات کے موقعے پر مغرب نے ہر کوشش ہی تو کر لی ہوگی کہ اردوغان نہ جیت پائیں۔ آخر انتخابات سے پہلے ہی بین الاقوامی میڈیا نے اندیشے ظاہر کرنے شروع کیے کہ انتخابات منصفانہ ہونا مشکل ہیں۔ کوشش تھی کہ کسی طرح پھر دخل اندازی کا موقعہ ملے۔ ہزاروں مبصرین کو بھیجا گیا، نتائج کے اعلانات کے بعد افواہیں بھی پھیلائی گئیں کہ الیکشن مشتبہ ہیں۔ پروپیگنڈے کے ذریعے ملک میں بے اطمینانی پیدا کرنے اور ترکی میں

تقسیم وتفریق کی آگ بھڑکانے کی سازش شروع ہوئی۔ اگر اپوزیشن ذرا ساتھ دے دیتی تو عوام کے دل میں شبہات پیدا ہوجاتے اور سازشوں کا کھیل شروع ہوجاتا۔ مگر حریف امیدوار محرم انچے صاحب سے جب یہ سوال پوچھا گیا تو انھوں نے ایسی سازشوں کے پنپنے کا امکان ہی ختم کردیا۔ انھوں نے پوری اخلاقی جرأت سے جواب دیا:

''اردوغان کو واضح اور مکمل اکثریت ملی ہے۔ ۸۰ فی صد سے زیادہ لوگوں نے انتخابات میں حصہ لیا ہے۔ اگر آپ اس کو نہیں قبول کریں گے تو کسے قبول کریں گے؟؟ اگر میں ان نتائج کو قبول نہ کروں اور سڑکوں پر احتجاج کروں تو یہ جمہوریت نہیں ہوگی، یہ اس کا مذاق ہوگا۔ کل اردوغان نے ایک بات کہی، مجھے بڑی اچھی لگی۔ انھوں نے کہا کہ ترکی میں ۸۰ فی صد ووٹ پڑے ہیں۔ جن ممالک میں ۳۰ فی صد لوگ الیکشن میں حصہ لیتے ہیں وہ ہمیں جمہوریت کا سبق نہ پڑھائیں''۔ اردوغان سے بہت سی باتوں میں میرے اختلافات ہیں۔ مگر ان کا مطلب یہ نہیں کہ ترکی منقسم ہے۔ ہرگز نہیں! کوئی ہمیں تقسیم نہیں کرسکتا۔

یہ قوم کی مضبوطی کی علامتیں ہیں۔ ایسی ہی مضبوطی اس وقت نظر آئی جب فوج نے بغاوت کی تھی۔ کسی سیاسی طاقت نے اس کی تایید کرکے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ عوام اپنی آزادیوں اور حق وانصاف کے لیے پہاڑ بن گئے۔ مغربی ممالک کی اصل طاقت ان کے مقتدر طبقات کی یہی اصول پسندی اور حق شناسی میں ہم پر واضح فوقیت ہے۔ ہم کو مسلم معاشروں میں اصول پسندی، ایمان داری اور حق شناسی کی قدروں کو فروغ دیے بنا کسی کامیابی کا خواب دیکھنا چھوڑنا ہوگا۔ ہم ہندی مسلمانوں کے لیے بھی یہی سبق ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ملت پر کچھ گزر جائے، ہم کو ہر وقت اپنی تنظیموں اور اپنی شخصیت کے مفادات وامکانات ہی مقصود رہتے ہیں۔ اس چیز نے ہم کو غیروں کا حقیر کھلونا بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عاجزی کے ساتھ دعا ہے کہ ہم کو اس بیماری سے محفوظ رکھے۔

جاننا چاہیے کہ ترکی سازشوں اور داخلی وبیرونی خطرات سے گھرا ہوا ہے۔ اس لیے خصوصی طور پر اس کے لیے دعاؤں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ذہن میں ترکی سے متعلق کچھ خدشات بھی ہیں، کچھ قابل اصلاح پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن جو اصل پیغام اور سبق حاصل کرنا تھا وہ ان کے تذکرے کے بغیر بھی مکمل حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کاش ان سطروں کا جو عرصے کے غور وفکر کا نچوڑ ہیں دینی وملی حلقوں میں سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے اور ان میں اگر کچھ مفید چیزیں ہوں تو قبول کیا جائے۔

جانشینِ حکیم الاسلام

حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ

۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء - ۱۴۳۹ھ/ ۲۰۱۸ء

(۳)

بہ قلم: مولانا نور عالم خلیل امینی
چیف ایڈیٹر ''الداعی'' عربی واستاذ ادبِ عربی
دارالعلوم دیوبند

مولانا قاسمیؒ نے تدریس وتقریر کے میدان میں گہرباری کے ساتھ، لوح وقلم کی بھی پرورش کی اوراس میدان میں بھی آپ کا انداز عالمانہ، محققانہ ونکتہ ورانہ تھا۔ اسلوبِ نگارش میں بھی وہی روانی وسلاست تھی جو آپ کے خطیبانہ کلام کا امتیاز تھی؛ لیکن تدریسی وخطابتی کارہائے دراز اوراُن کے لیے مسلسل اسفار نے ، نیز ۱۹۸۲ء/ ۱۴۰۲ھ میں دارالعلوم وقف کے قیام کے بعد اُس کی انتظامی وتدریسی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہنے کے بعد کارتحریر وتالیف کے لیے، جو خاصی تنہائی اورسنجیدہ فرصتِ عمل کا متقاضی ہوتا ہے، اُن کے پاس وقت نہیں رہ گیا تھا،لیکن منظم زندگی گزارنے کی وجہ سے جو انھیں اپنے عظیم والد حضرت حکیم الاسلامؒ سے ورثے میں ملا تھا، رسائل اور خطبہ ہائے صدارت وکلمہ ہائے افتتاح ومقدمہ ہائے کتب کی شکل میں اپنی تحریروں کا جو اثاثہ چھوڑ گئے، وہ خاصا گراں مایہ ہے، جو اُنھیں ایک شان دار قلم کار اور تجربہ کار انشا پرداز کا رتبہ عطا کرنے کے لیے کافی ہے، جس میں علم وفضل اور عقل ونقل کی قدم قدم پر وہی جلوہ گری ہے؛ جو فکرِ قاسمی کی لاینفک شناخت ہے۔

بہ ہر کیف جو کتابیں یا رسائل، ان کی خامہ آرائی کے نتیجے میں سامنے آئے اُن میں سے کچھ یہ ہیں:

۱- ان کی ایک ادبی تخلیق ''مردانِ غازی'' کے عنوان سے، افسانہ ہے، جس میں اُنھوں نے یہ بتایا ہے کہ کبھی ہم مسلمان مشرق ومغرب پر حکم راں تھے، ہر جگہ اسلامی اقتدار قائم تھا اور ساری زمین

پر خدائی قانون نافذ تھا۔ آج یہ حال ہے کہ ہم ہر جگہ محکوم ومظلوم ہیں، ہمیں زبان کھولنے کا بھی یارا نہیں، ہم کس قدر ذلیل اور بے دست و پا ہیں

یہ افسانہ انھوں نے پنج شنبہ: ۱۶؍جنوری ۱۹۴۷ء (۲۳؍ربیع الاول ۱۳۶۶ھ) کو لکھا تھا اور ''انجمن شمع ادب'' جالندھر کے جنرل سکریٹری جناب سعید الدین شیرکوٹی نے، ۷؍فروری ۱۹۴۷ء (۱۴؍ربیع الآخر ۱۳۶۶ھ) کو اس پر اپنی تقریظ لکھی اور اپنی انجمن کی طرف سے ایک ہزار کی تعداد میں شائع کیا، اس وقت اس افسانے کے ایک نسخے کی قیمت ۳ آنے تھی۔ یہ افسانہ بڑے سائز کے ۲۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

گویا انھوں نے یہ کتاب اپنی طالب علمی میں لکھی تھی جب وہ مشکاۃ شریف کے سال میں متعلمِ دارالعلوم دیوبند تھے۔ زبان وبیان کی سلاست ایک کہنہ مشق رائٹر کا پتہ دیتی ہے۔

۲- ''حقیقتِ معراج'' یہ کتاب بڑے سائز کے ۵۰ صفحات پر چھپی ہوئی ہے، اسے اِدارہ نشر واشاعت دارالعلوم دیوبند نے شائع کیا تھا۔ یہ ابوالاعلی مودودی کی کتاب ''معراج کی رات'' کے رد میں اور اس کے مشمولات کی علمی تنقید وگرفت کے موضوع پر، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کی فرمایش پر لکھی گئی تھی۔ مولانا قاسمیؒ نے اس کتاب میں مودودی صاحب کی فاضلانہ گرفت کی ہے، جو کچھ لکھا ہے بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھا ہے۔ یہ کتاب ہر عالم ومتعلّم کے پڑھنے کی چیز ہے۔

۳- مبادئ تربية الأطفال الاسلامية: ۲۳ صفحات پر مشتمل عربی کا رسالہ ہے جو دارالعلوم دیوبند نے ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء میں اپنے پریس سے شائع کیا تھا، اس رسالے میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ بچوں کی تربیت مقدس انسانی فریضہ ہونے کے ساتھ، عقل انسانی کا اولین تقاضا بھی ہے۔ اسلام نے اس پر جتنا زور دیا ہے، کسی مذہب نے اور دنیا کی کسی تحریک وتنظیم نے اس منظم طریقے سے اس کا اہتمام نہیں کیا ہے۔ انھوں نے تربیتِ اطفال کے موضوع پر اسلامی اصولوں اور تعلیمات کو تفصیل سے ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اسلامی اصولِ تربیت اطفال نے غیر معمولی تدریجیت اور مرحلہ واریت کو پیش نظر رکھا ہے، جس سے تربیت پانے والا بچہ نہ کوئی بوجھ محسوس کرتا ہے نہ اپنے طبعی غرائز کے خلاف کسی دباؤ کا اسے کوئی احساس ہوتا ہے۔

۴- ''ایک عظیم تاریخی خدمت۔۔اکابر دارالعلوم دیوبند کی تمام چھوٹی بڑی کتب کا مکمل تعارف'' یہ کتاب چھ چھوٹے سائز کے ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے اپنے ذاتی ادارہ ''تاج

المعارف دیوبند'' کے تحت اکابر دارالعلوم کے علمی کارناموں کے تعارف کے ایک عظیم الشان پروگرام کو تفصیل سے متعارف کرایا ہے اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ عبدالعزیزؒ سے لے کر دور حاضر کے علماے دیوبند ومشائخ دارالعلوم کو پانچ طبقوں میں تقسیم کرکے ان کے نام طبقہ وار لکھے ہیں کہ ہمارے کام کی یہ ترتیب ہوگی کہ ہم پہلے طبقے کے اکابر کی تخلیقاتِ علمی کا تعارف کرائیں گے، پھر بہ تدریج آگے کو بڑھیں گے۔ جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ سے لے کر موجودہ دور تک کے بزرگانِ دیوبند میں سے جملہ مصنفین کی تمام چھوٹی بڑی، علمی، اصلاحی، تاریخی، ادبی، سیاسی، تصوفی اوراخلاقی تصانیف کا علاحدہ علاحدہ مکمل تعارف کتابی صورت میں مرتب کرکے شفاے روحانی کا یہ ''مجرب نسخہ'' عالم انسانی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

دوسرا اقدام یہ ہوگا کہ اس کتاب کو پہلے اردو میں شائع کیا جائے گا پھر عربی اور انگریزی میں۔

تیسرا اقدام یہ ہوگا کہ اکابرِ دیوبند کی بہترین اور منتخب کتابوں کا عربی اور انگریزی ترجمہ دور حاضر کے مذاق کے مطابق شائع کیا جائے گا۔

چوتھا اقدام یہ ہوگا کہ اکابرِ دیوبند کی جو کتابیں مشکل ہیں اور جن میں الفاظ وعبارتیں پیچیدہ آگئی ہیں، اُنھیں آسان عبارتوں میں تشریحات کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جائے گا۔

مولانا محمد سالم قاسمیؒ نے اس پروگرام کے گوشے گوشے کو بہت مرتب اور مفصل انداز میں بیان کیا ہے، اگر یہ پروگرام روبہ عمل آگیا ہوتا، تو اس تاریخی کارنامے کی کوئی نظیر نہ ہوتی، جس کے پورا ہونے کا سارا زمانہ منتظر ہے اور یہ کام قاسمی نسلِ نو کی گردن پر ایک واجب الادا قرض بھی ہے اور فرض بھی۔

۵- سیرت کے موضوع پر اُن کا ایک گراں قدر رسالہ ''تاج دارِ حرم کا پیغام'' بھی ہے، جو ہمیشہ اشاعت پذیر ہونے کا متقاضی ہے۔

۶- اُن کا ایک رسالہ ''جائزہ تراجم قرآن'' ہے جو قیمتی علمی رسالہ ہے اور علما وطلبہ کے لیے بے حد مفید ہے۔

۷- اُنھوں نے بہت سی مرتبہ سفر کے دوران ڈائری لکھنے کا بھی التزام کیا تھا، جو سفر ناموں کی شکل میں ترتیب کا متقاضی ہے۔ ان میں سے ایک سفرنامہ بعنوان ''سفر نامۂ برما'' طبع ہو چکا ہے۔

۸- اُن کے بہت سے خطبات، مقدمات وتقریظاتِ کتب اور کلماتِ صدارت، مختلف علمی موضوعات پر علمی تحقیق اور فکری استنتاج کا نادر نمونہ ہیں، جو انھوں نے بہت مطالعے اور گہری سوچ کے بعد لکھے ہیں۔ انھیں بہ عجلت مطبوعہ شکل میں منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

۹-شفوی تقریروں کا جو ریکارڈ دست یاب ہوسکے وہ بڑا علمی خزانہ ہوگا، اس کو بہ عجلت تمام شائع کرکے محفوظ کرنے اور علمی حلقوں تک پہنچنے کو آسان بنانا بھی بہت ضروری ہے، جس سے اُن کے سپوت اخلاف غافل نہ ہوں گے۔ان شاء اللہ۔

نثر نگاری کے ساتھ والد ماجد حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کی طرح شعر گوئی میں بھی حصہ لیا، چناں چہ کئی نظمیں اُن کی جولانیٔ طبع کی گواہی کے لیے اُن کے بیاض کے اوراق میں نیز مطبوعہ شکل میں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔مولانا قاسمیؒ شعروسخن میں ندیمؔ تخلص کرتے تھے۔

دوشنبہ: ۱۵؍ذی قعدہ ۱۳۶۷ھ مطابق ۲۰؍ستمبر ۱۹۴۸ء تا جمعہ: ۱۵؍صفر ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۷؍دسمبر ۱۹۴۸ء کی مدت میں حضرت حکیم الاسلامؒ اور اُن کی اہلیہ محترمہؒ کا حج وزیارت کا سفر ہوا۔ مولانا قاسمیؒ نے اس مبارک موقع سے ''مقدس زائرین حرم سے'' کے عنوان سے ۲۶ شعروں پر مشتمل جو قصیدہ کہا تھا، اُس کے چند شعر یہ ہیں۔یاد رہے کہ اس وقت شاعر کی عمر کل ۲۲ سال تھی:

حریم رحمۃٌ للعالمین جانا مبارک تھا ... زِسرتاپا سعادت بن کے آجانا مبارک ہو
سراپا شوق بن کر حاضری رحمت ہی رحمت تھی ... تمنائے مکرر لے کے آجانا مبارک ہو
زمانہ منتظر تھا بزم ایماں میں اُجالے کا ... تمنائیں تھیں دل میں، شوق تھا کچھ فیض پانے کا
مثیل ''قاسم'' و''محمود'' شب بیدار آئے ہیں ... وہ فخر دیوبند، زینت دہِ گل زار آئے ہیں
میں بالکل بے بضاعت ہوں نہیں ذوقِ سلیم ایسا ... کہ اُن کی شان میں لکھ دوں کوئی قول کریم ایسا
جو ماں کے رتبۂ عالی کو بھی پورا عیاں کردے ... اور اس رفعت کے ہم پلّہ ہی تہنیت بیاں کردے
ارادہ دل میں تہنیت کا باصدق وصفا آیا ... زباں پر بے ارادہ قولِ ''ربِّ ارحمھا'' آیا
ندیمؔ الفاظ میں اِس مرتبہ ایسا اثر دیکھوں ... کہ اپنے آپ کو اس قافلے کا ہم سفر دیکھوں

۴؍ذی قعدہ ۱۳۷۰ھ مطابق ۸؍اگست ۱۹۵۱ء تا ۲۶؍محرم ۱۳۷۱ھ مطابق ۲۹؍اکتوبر ۱۹۵۱ء، مولانا قاسمیؒ کے والدینؒ نے حج وزیارت کا سفر کیا، اُن کی واپسی پر اُنھوں نے ۷ شعروں پر مشتمل ''ہدیۂ عقیدت'' کے عنوان سے جو قصیدہ موزوں کیا، اس کے دوتین شعر اس طرح ہیں:

گل زارِ وطن میں ہر جانب پر کیف بہاریں رقصاں ہیں ... شاداں ہے چمن کا ہر ذرّہ اُترے ہوے چہرے خنداں ہیں
وہ پاک نگاہیں نازاں ہیں جو روضۂ جنت دیکھ آئیں ... فرخندہ جبینِ تاباں ہیں جبریل کا مَہبط دیکھ آئیں
تبریک کا ہدیہ کیا لائیں بن آئے گا کیا ناشادوں سے ... یہ جذب وکشش یہ عشقِ نبی بالا ہے مبارک یادوں سے

اپنے برادرِ خرد مولانا محمد اسلم قاسمیؒ کی شادی خانہ آبادی کے موقع سے مولانا قاسمیؒ نے ''نغمۂ

تہنیت‘‘ کے عنوان سے ایک خوب صورت قصیدہ کہا تھا، جس کے کچھ اشعار یہ تھے، پورا قصیدہ دس شعروں پر مشتمل ہے:

حیاتِ نو کی یہ منزل مبارک وفورِ شوق کا یہ حاصل مبارک
عزیز اسلم بایں یمن وسعادت یہ نقد دل بہ نقدِ دل مبارک
طلوع مہر تابانِ محبت عروجِ فکرو سامانِ محبت
نگاہیں ترجماں ہیں آج جس کی مبارک ہو یہ عرفانِ محبت

اپنی ہمشیرہ عزیزہ ’’حمیرہ‘‘ کی شادی کے موقع سے رخصتی کی تقریب کے وقت ۲۴ شعروں پر مشتمل ایک پرسوز وپرجذبات قصیدہ کہا تھا، جس کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

اے شریکِ شیرِ مادر، اے محبت کی شعاع آج اِن لرزاں لبوں پر آ گیا لفظِ وداع
الوداع اے رونق بزمِ محبت الوداع الوداع اے پیکرِ صدق ودیانت الوداع
الوداع اے مخزنِ اخلاص والفت الوداع الوداع اے گلشن طیبؔ کی نکہت الوداع
آ گئے ہیں آج وہ لمحے کہ تو جانے لگی سینۂ ماں باپ سے سُن کیا صدا آنے لگی
اِک نئے ماحول سے دوچار ہونا ہے تجھے اجنبی نظروں میں دل کا پیار ہونا ہے تجھے
دیکھ اُس ماحول میں رکھنا بزرگوں کا خیال عظمتِ اسلاف کے شیشے میں آجائے نہ بال
قاسمؔ نانوتوی کی روح تیرے ساتھ ہے آبروے حلقۂ اسلاف تیرے ہاتھ ہے

۱۴ شعروں پر مشتمل ایک قصیدہ ۱۶/ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۲۳/اپریل ۱۹۹۷ء کو ’’نذرِ حجاج بیت اللہ الحرام‘‘ کے عنوان سے مولاناؒ نے کہی تھی، اُس کے چند اشعار ذیل میں ثبت کیے جارہے ہیں۔ یہ قصیدہ حجاج کرام کی واپسی پر کہا گیا تھا، اس قصیدے میں ’’ارض حرم‘‘ اور ’’ارض وطن‘‘ کا نمایاں اور واقعی فرق بتایا گیا ہے، جو بہت پرلطف، صداقت ریز، حقیقت خیز اور درس انگیز ہے:

جہاں کل تھے، وہاں ہر نقش پا نقش ہدایت تھا جہاں اب ہو، ضلالت کا سبو لبریز ہے ساقی
جہاں کل تھے، وہاں بوبکر وعثماں کی وفائیں تھیں جہاں اب ہو، جفاؤں میں ہر اک چنگیز ہے ساقی
جہاں کل تھے، وہاں تھی دین وایماں کی سرافرازی جہاں اب ہو، دیانت داں سیاست ریز ہے ساقی
جہاں کل تھے، وہاں باطل شکن لہریں ہی لہریں تھی جہاں اب ہو، وہاں باطل بلا انگیز ہے ساقی
شفا کا نسخۂ نایاب، مکہ سے ہوا حاصل ادھر خاکِ مدینہ، جو شفا آمیز ہے ساقی
پیام حق رسانی ہوگئی پیدا، اگر دل میں تو حج ’’مبرور‘‘ ہے اس کی، یہ دستاویز ہے ساقی

''ترانۂ مظلومین'' کے نام سے مولاناؒ نے بچوں کے لیے ایک نظم کسی نفیسؔ شاعر کے شعر پر تضمین کرتے ہوے کہی تھی، یہ ترانہ، زبان وبیان، ترکیب کی صفائی، خیال کی بلندی، طرزادا کی گل اَفشانی کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہے۔ اِس مضمون کی تنگ دامانی کی وجہ سے صرف چند اشعار نذر قارئین کیے جارہے ہیں:

بحمد اللہ، حق کا بول بالا ہونے والا ہے ۔۔۔ سیاہی چھٹ رہی ہے، اب اجالا ہونے والا ہے
خدا کے گھر کے دشمن! سُن ندائے غیب آتی ہے ۔۔۔ کہ تو برباد اب تو ، لامحالہ ہونے والا ہے
دیارِ دل کے شیطاں کو، کوئی جا کر یہ بتلادے ۔۔۔ تہ وبالا، ترا اِیوانِ بالا ہونے والا ہے
تو کرلے ظلم، تجھ سے مومنوں پر ہوسکے جتنا ۔۔۔ ترا اے روسیہ! منھ اور کالا ہونے والا ہے
شہادت پانے والو! لو مبارک وقت آ پہنچا ۔۔۔ تمہارے زیبِ تن، خلدی دوشالہ ہونے والا ہے
مرا قرآن کہتا ہے، مرا ایمان کہتا ہے ۔۔۔ ظہورِ نصرتِ باری تعالی ہونے والا ہے

دین ودعوت اور تعلیم وتربیت کے میدان کی ہمہ گیر مشغولیت نے، انھیں شعروشاعری کی طرف لائقِ ذکر توجہ دینے کی فرصت نہیں دی؛ ورنہ موزونیتِ طبع سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس کوچے میں ذرا بھی طواف کرتے، تو ایک اچھے شاعر ہونے کی شناخت رکھتے۔

مناصب واعزازات

حضرت مولانا قاسمیؒ نے جنوری ۱۹۴۹ء (ربیع الآخر ۱۳۶۸ھ) میں اکابرِ دیوبند کی علمی وفکری تصنیفات کو معیاری طور پر شائع کرنے کے لیے ایک اشاعتی ادارہ ''اِدارۂ تاج المعارف'' کے عنوان سے قائم فرمایا، اُس وقت کے میسر وسائل وامکانات کے بہ قدر، کئی سال تک یہ ادارہ برسرعمل رہا اور متعدد علمی کتابیں اشاعت پذیر ہوکر اہلِ علم وطلبہ کے لیے سنجیدہ مطالعے کا ذریعہ بنیں۔

۱۹۶۶ء/ ۱۳۸۶ھ میں مراسلاتی طریقۂ تعلیم کی بنیاد پر، عصری تعلیم گاہوں میں زیرتعلیم طلبہ وطالبات کے لیے، اسلامی علوم ومعارف کے حصول کو آسان بنانے کی غرض سے؛ جامعہ دینیات قائم فرمایا، جو سال ہا سال تک محوِ خدمت رہا۔

اُن کی علمی عظمت کو متعدد اداروں اور تنظیموں نے سلام کیا، وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے تاحیات نائب صدر رہے، جس کی تاسیس میں اپنے والد ماجد حکیم الاسلامؒ کے ہم دوش رہے، مسلم مجلسِ مشاورت کے صدر رہے، دارالعلوم ندوۃ العلما اور مظاہر علوم وقف سہارن پور کی شوری کے رکن رکین بھی رہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد تنظیموں اور اداروں کی انھوں نے سرپرستی کی۔

مصر کی وزارتِ اوقاف ماہ ربیع الاول کے موقع سے منعقد کردہ اپنی سالانہ کانفرنسوں میں انھیں کئی سال تک مسلسل مدعو کرتی رہی، ایک کانفرنس میں اس نے انھیں ''نوط الامتیاز'' (نشانِ امتیازۃ یا تمغۂ امتیاز) ایوارڈ سے نوازا۔ فروری ۲۰۱۴ء مطابق ربیع الآخر ۱۴۳۵ھ میں جنوبی افریقہ کے ''جوہانسبرگ'' شہر میں انھیں ''حضرت امام قاسم نانوتوی ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ جب کہ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت نے ۳۱/اگست ۲۰۱۵ء مطابق ۱۵/شوال ۱۴۳۶ھ کو اپنی پچاس سالہ گولڈن جوبلی کے موقع سے، انھیں قومی یکجہتی، حقوقِ انسانی اور علمی خدمات کے اعتراف میں اپنے ایوارڈ سے نوازا۔

بیعت وخلافت

۱۹۴۸ء/ ۱۳۶۷ھ میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ (تقریباً ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء - ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء) کی خدمت میں خانقاہِ رائے پور حاضر ہوکر اُن کے دست گرفتہ ہوئے، کچھ دنوں وہاں مسلسل قیام فرمایا؛ لیکن تدریسی ذمے داریوں کی وجہ سے ایک ساتھ طویل المدت قیام ممکن نہ تھا؛ اس لیے دیوبند واپس آگئے اور حضرت رائے پوریؒ کے بتائے ہوئے اصول وہدایت پر عمل کرتے رہے؛ لیکن ہفتے میں ایک بار ہر جمعرات کو حاضر ہوکر جمعہ کو واپسی کا سال ہا سال تک اہتمام رہا، تا آں کہ ۱۴/ربیع الآخر ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۶/اگست ۱۹۶۲ء کو مولانا رائے پوریؒ کی وفات ہوگئی۔

۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء میں مولانا قاسمیؒ کا اپنے والد محترم حضرت حکیم الاسلامؒ کے ہم راہ جنوبی افریقہ کا سفر ہوا، اسی سفر کے دوران اُنھوں نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں جب مولانا قاسمیؒ بنگلور میں مقیم تھے اور حضرت حکیم الاسلام بمبئی (موجودہ ممبئی) میں قیام فرما تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے بہ ذریعہ مکتوب گرامی فرزند ارجمند کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔

بہت ساری تدریسی وتقریری وانتظامی ودعوتی سرگرمیوں کے ساتھ، اُن کا تزکیہ واحسان کا سفر جاری رہا اور اپنے اسلاف گرامی کی اس راہ پر بھی وہ کسی وقفے اور ناغے کے بغیر مسلسل محوِ سفر رہے۔ انھوں نے بیعت وارشاد کا عمل بھی جاری رکھا۔ چناں چہ بہت سے لوگ ان کے حلقۂ ارادت سے وابستہ ہوئے اور بیعت وخلافت واجازت سے سرفراز ہوئے، جن کی تعداد سو سے متجاوز بتائی جاتی ہے۔

اولاد واحفاد

مولانا محمد سالم قاسمیؒ کی شادی دیوبند کے ایک ذی اثر خانداں میں جناب پیش کار محمد اختر عثمانی صاحب کی دختر نیک اختر ''اَمَۃُ الِاکرام'' صاحبہ سے ہوئی، بہ غرض ملازمت یہ خاندان شہر سہارن پور

میں آباد ہوگیا تھا۔ مولاناؒ کا نکاح جمعہ: ۲۶؍مارچ ۱۹۴۸ء (۱۴؍جمادی الآخرۃ ۱۳۶۷ھ) کو ہوا، رخصتی اُسی سال ۲۶؍دسمبر ۱۹۴۸ء (۲۳؍ربیع الاول ۱۳۶۸ھ) کو ہوئی۔ مولانا قاسمیؒ کی اولاد میں ۴ لڑکے اور ۲ دولڑکیاں ہوئیں، جن کی تفصیلات بہ لحاظ عمر درج ذیل ہے:

۱- محمد سلمان قاسمی، ولادت: ۱۳؍ستمبر ۱۹۵۰ء (۲۸؍ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ) شرح جامی تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے بارہویں کی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی اے اور ایم اے کیا۔ ان کا نکاح گنگوہ کے مشہور اجمیری خاندان میں حکیم سعید گنگوہیؒ کے پوتے حکیم سعد رشیدؒ کی صاحب زادی ''طلعت فاطمہ'' سے ہوا۔

۱۹۸۶ء/ ۱۴۰۶ھ میں پاکستان جابسے، ہنوز وہیں کے باسی ہیں۔ وہاں پی آئی اے میں برسرعمل رہے، اب ریٹائرڈ ہوگئے ہیں۔

محمد سلمان قاسمی کی اولاد میں ایک لڑکا اور دولڑکیاں ہیں: محمد اسامہ قاسمی جو اس وقت ساؤتھ افریقہ میں مقیم ہیں۔

مریم قاسمی صاحبہ: کراچی میں مقیم ہیں۔ مشہور عالمِ دین مولانا اسعد تھانوی کے فرزند حافظ محمد طلحہ کے نکاح میں ہیں۔

ہِبہ قاسمی صاحبہ: یہ بھی کراچی کی باسی ہیں، اُن کے خاوند کا نام محمد نعمان ہے۔

۲- مولانا سفیان قاسمی زید مجدہ: ولادت ۲۶؍ستمبر ۱۹۵۴ء (۲۷؍محرم ۱۳۷۴ھ) ۵ سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۷۶ء (۱۳۹۶ھ) میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔ دارالعلوم سے فراغت کے فوراً بعد جامعۃ الازہر میں داخل ہوئے ۱۹۷۹ء کے اواخر (۱۴۰۰ھ کے اوائل) میں وہاں سے ماجستیر کی ڈگری کے ساتھ واپس آئے۔ ۱۹۸۲ء/ ۱۴۰۲ھ میں آپ کا نکاح ''پُرقاضی'' کے حافظ سلطان احمد فاطمی کی صاحب زادی محترمہ ''صفیہ'' سے ہوا۔

مولانا سفیان کے دو صاحب زادے ہوئے:

۱- محمد صہیب قاسمی: تاریخ ولادت ۹؍مارچ ۱۹۸۴ء (۵؍رجب ۱۴۰۴ھ) ہے۔ ابتدائی عصری تعلیم دیوبند میں حاصل کی، بمبئی سے گریجویشن کیا۔ اس وقت لندن میں برسرِ روزگار ہیں۔ ۲۰۰۹ء (۱۴۳۰ھ) میں نکاح ہوا۔

۲- مولانا محمد شکیب قاسمی: ولادت ۸؍مارچ ۱۹۸۸ء (۱۷؍شعبان ۱۴۰۸ھ) ابتدائی تعلیم عصری اسکول میں حاصل کی، ۱۹۹۷ء (۱۴۱۷ھ) میں اسکول کی تعلیم کو چھوڑ درجۂ حفظ میں داخل

ہوے، ۲۰۰۰ (۱۴۲۱ھ) میں حفظ کی تکمیل کی۔ اس کے بعد درس نظامی کے مطابق تعلیم کا آغاز ہوا۔ ۲۰۰۹ء (۱۴۳۰ھ) میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوے۔ ۲۰۱۰ء (۱۴۳۱ھ) میں جامعہ اسلامیہ عالمیہ ملیشیا میں داخل ہوکر ماجستیر اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۲۰۱۳ء (۱۴۳۴ھ) میں شادی خانۂ آبادی ہوئی۔ ان کے ایک بیٹی ہے جس کا نام ''حفصہ'' ہے۔

۳- ''اسماء قاسمی'': تاریخ پیدایش: ۲۶/جنوری ۱۹۵۲ء (۲۸/جمادی الاولی ۱۳۷۱ھ) ابتدائی تعلیم دیوبند میں حاصل کی، بعدہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فاصلاتی کورس کے ذریعے گریجویشن کیا۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ سارے بچے آسٹریلیا میں مقیم ہیں، جب کہ ایک فرزند حافظ احمد یاسر جاپان میں برسرِ روزگار ہیں۔

۴- محمد عدنان قاسمی: تاریخ پیدایش: ۱۱/اپریل ۱۹۵۷ء (۱۰/شوال ۱۳۷۶ھ) ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی، اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے بارہویں کیا پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۸۶ء (۱۴۰۶ھ) میں مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی دیوبندی کی صاحب زادی محترمہ ''رومہ'' سے ان کا نکاح ہوا، جن سے ان کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹی یسریٰ قاسمی اِس وقت اپنے خاوند اور دو بچوں کے ساتھ کنیڈا میں مقیم ہیں، جب کہ بیٹا یاسر قاسمی دہلی میں زیر تعلیم ہے۔

۵- عظمی ناہید: ولادت ۱۲/دسمبر ۱۹۶۰ء (۲۲/رجب ۱۳۸۰ھ) ۱۹۷۷ء (۱۳۹۷ھ) میں ان کی شادی مولانا حامد الانصاری غازی کے فرزند جناب سلمان منصور غازی سے ہوئی، اُن کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئی: محمد علی: ولادت: ۱۹۸۲ء (۱۴۰۲ھ) اس وقت عمان میں برسر روزگار ہیں۔ ثناء غازی: ولادت: ۱۹۸۶ء (۱۴۰۶ھ) اس وقت جرمنی میں ایک مقامی یونیورسٹی میں پروفیسر کی خدمت پر مامور ہیں۔

۶- حافظ محمد عاصم قاسمی: ولادت: ۶/جنوری ۱۹۶۷ء (۲۲/شوال ۱۳۸۶ھ) بارہویں تک کی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں حاصل کی، امریکہ میں گریجویشن کی تکمیل کی، تا حال وہیں برسر روزگار ہیں۔ وہ دیوبند میں ''طیب ٹرسٹ'' کے نام سے ایک ادارہ بھی چلاتے ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں: محمد طیب قاسمی اور محمد عمر قاسمی، دونوں زیر تعلیم ہیں۔

(تحریر کردہ ۲ بجے بہ وقت ظہر، سہ شنبہ:
۱۳/رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۹/مئی ۲۰۱۸ء)

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد مصطفےٰ اعظمیؒ

از: اختر امام عادل قاسمی
مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف

حضرت شیخ ڈاکٹر محمد مصطفےٰ اعظمی قاسمیؒ عصر حاضر کے ان ممتاز علماء میں تھے جنہوں نے اپنے علم اور قلم سے جریدۂ عالم پر نقشِ دوام ثبت کیا، جن کو نہ لوحِ تاریخ سے محو کیا جاسکتا ہے اور نہ دلوں کی دنیا سے فراموش کرنا ممکن ہے، جب تک علم کی دنیا آباد ہے، وہ ملت اسلامیہ کی روشن پیشانی پر چمکتے رہیں گے، ان کی فکر وفہم قدرت کے مخصوص سانچے کی تراشیدہ تھی، ان کے ذہن ودماغ کے تمام دریچے کھلے ہوئے تھے، وسیع علم اور ذہن رسا کے ساتھ بلیغ قلم کی نعمت بھی انھیں میسر تھی، کئی زبانوں پر ان کو اہلِ زبان جیسی قدرت حاصل تھی، انھوں نے کیمبرج یونیورسیٹی سے فن حدیث پر انگریزی زبان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، عربی اور انگریزی میں ایک درجن سے زائد کتابیں لکھیں، حدیث وسیر کے کئی اہم ترین مجموعوں کو اپنی گراں قدر تحقیقات وتعلیقات سے مزین کیا۔

قرآنی خدمات

❁ انگریزی زبان میں ان کا گراں قدر کارنامہ تدوین قرآن کریم پر مستشرقین کے اعتراضات کا دنداں شکن جواب ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ نائن الیون سے قبل ایک مشہور انگریزی میگزین ''اٹلانٹک منتھلی'' (Atlantic Monthly) میں ''ٹوبی لسٹر'' کا ایک مضمون شائع ہوا ''واٹ از دَ قرآن'' (قرآن کیا ہے؟)، جس میں اس نے یمن کے بعض قرآنی مخطوطوں میں الف کی کتابت پر اعتراضات کیے تھے، اور اس کا مقصد حفاظتِ قرآن کے تعلق سے مسلمانوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنا تھا، ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں یہ کتاب لکھی:

"The history of the Quranic Text, from Revelation to Compelation: A comparative study with the Old and New Testaments"

اس کتاب میں آپ نے قرآن کریم کی تدوین کی مدلل تاریخ بیان کی اور اس کے متن کی دائمیت پر سیر حاصل گفتگو کی، نیز صحابی رسولؐ حضرت زید بن ثابتؓ کے ذریعہ قرآن کریم جمع کرنے کی تاریخی تفصیل بھی رقم کی، آپ نے اس کتاب میں مغربی ممالک کے محققین کا زوردار تعاقب کیا اور قرآن کریم کی تحریف سے متعلق ان کے دعووں اور عزائم کی پول کھول کر رکھ دی۔

بعد میں آپ نے خود ہی اس کتاب کا عربی ترجمہ: "**تاریخ النص القرآنی من الوحی الی التدوین دراسةً مقارنةً مع العهد القدیم والعهدالجدید**" کے نام سے کیا، یہ کتاب لندن کی اسلامک اکیڈمی سے ۲۰۰۳ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی، اس کے بعد کناڈا، امارات، سعودی عرب، اور کویت سے اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے، ترکی، ملیشیائی اور دیگر کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی شائع ہوئے۔ اردو میں غالباً اس کا ترجمہ شائع نہیں ہوسکا ہے۔

❁ قرآن کریم کے موضوع پر آپ کی ایک اور کتاب "**تاریخ تدوین القرآن الکریم التحدی القرآنی**" بہت اہم ہے۔

❁ زندگی کی آخری کتاب بھی قرآن کریم ہی کے موضوع پر ہے:

"Ageless Qur'an - Timeless Text" (صفحات ۲۵۰)

یعنی **النص القرآنی الخالد عبرالعصور**" یہ کتاب دراصل مستشرقین کی جانب سے قرآن کریم کے متعدد نسخوں پر کیے جانے والے اعتراضات کا مدلل جواب ہے، اس کتاب کی تیاری میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی عمر عزیز کے پورے پندرہ (۱۵) سال خرچ کیے، اس کے لیے مختلف ممالک کے اسفار بھی کیے، دنیا میں موجود قرآن کریم کے مشہور ومعروف انیس (۱۹) مخطوطوں کا موازنہ کرکے اس کتاب میں آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ڈیڑھ ہزار (۱۵۰۰) سال کے اندر قرآن کریم کے الفاظ میں کوئی تغیر وتبدل پیش نہیں آیا، ایک سو پچاس (۱۵۰) صفحات والی اس کتاب میں مذکورہ مخطوطوں کے درمیان موازنہ کے علاوہ پچاس پچاس (۵۰) صفحات پر عربی اور انگریزی میں ایک مفصل مقدمہ بھی شامل ہے، یہ کتاب ترکی سے شائع ہوچکی ہے۔

فقہی خدمات

❁ فقہ اسلامی پر بھی عہد قدیم سے ہی مستشرقین کے اعتراضات ہوتے رہے ہیں اور علماء نے ان کے جوابات بھی دیئے ہیں، اس موضوع پر عصر حاضر میں سب سے اہم ترین کام ڈاکٹر محمد حمیداللہ

حیدرآبادیؒ کا ہے، یہ حقیر بھی اپنی کتابوں اور مضامین میں ان کا خوشہ چیں رہا ہے؛ لیکن اس میدان میں اگر کوئی دوسرا بڑا نام پیش کیا جاسکتا ہے تو وہ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمیؒ کا ہے، خاص بات یہ ہے کہ آپ کا کام انگریزی زبان میں ہے اور مستشرقین کو ان کی زبان میں جواب دیا گیا ہے، آپ کی کتاب "On Schacht's Origins of Muhammadan Jurisprudence"(صفحات:۲۴۳) کو اس موضوع پر کافی شہرت حاصل ہوئی، اس میں فقہ اسلامی کے تعلق سے مشہور مستشرق ''شاخت'' کے اعتراضات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء میں نیویارک سے اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۶ء میں انگلینڈ سے شائع ہوا، ترکی زبان میں اس کا ترجمہ ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔

حدیث کے میدان میں بے مثال خدمات

علم حدیث ڈاکٹر صاحبؒ کا اصل میدان تھا، آپ نے اس فن کو نئی تکنکوں اور نئے امکانات سے آشنا کیا اور عمر عزیز کا بڑا حصہ اس فن شریف کی خدمت میں صرف کیا، آپ کی حدیثی خدمات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: تحقیقی خدمات اور دفاعی خدمات:

تحقیقی خدمات

(۱) تحقیقی خدمات میں کئی چیزیں آپ کی اولیات میں سے بھی ہیں، مثلاً:

❁ دنیا میں پہلی بار آپ نے احادیث مبارکہ کی عربی عبارتوں کو کمپیوٹرائزڈ کیا، جس سے اہلِ علم کو احادیث کی تحقیق و تلاش میں کافی سہولت حاصل ہوگئی، یہ اتنا بڑا صدقہ جاریہ ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی میں تنہا یہی کام کیا ہوتا تو بھی ان کی عظمت و انفرادیت کے لیے کافی ہوتا، چہ جائے کہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے تحقیقی کارنامے آپ نے انجام دیئے۔

❁ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسیٹی میں آپ حدیث کے پہلے استاذ ہوئے۔

❁ حدیث کے کئی اہم مجموعے آپ کی تحقیقات و تعلیقات سے مزین ہوکر شائع ہوئے، صحیح ابن خزیمہ کے بارے میں پہلے عام خیال یہ تھا کہ یہ نایاب ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس نایاب کتاب کو دریافت کیا، اور تحقیق و تعلیق کے بعد چار (۴) جلدوں میں شائع فرمایا، اس کا پہلا اور تیسرا ایڈیشن بالترتیب ۱۹۷۰ء اور ۱۹۹۳ء میں بیروت سے شائع ہوا، دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۲ء میں ریاض سے شائع ہوا، اور بھی کئی ایڈیشن نکلے(۱)۔

❁ اسی طرح سنن ابن ماجہ کو بھی آپ نے تحقیق کرکے چار جلدوں میں ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔

❁ حدیث پاک کے قدیم ترین مجموعہ ''موطا امام مالکؒ'' کو بھی آپ نے تحقیق و تخریج کے بعد

آٹھ(۸)جلدوں میں شائع کیا،موطا کے رُوات پر بھی کام کیا۔

❁**العلل لعلی ابن عبدالله المدینیؒ:** آپ کی تحقیق وتعلیق کے بعداس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۲ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔

❁**سنن کبریٰ للنسائی:** ۱۹۶۰ء میں آپ نے اس کا مخطوطہ حاصل کیا اور تحقیق وتخریج کے بعداس کی اشاعت کرائی۔

❁**مغازی رسول الله ﷺ لعروۃ بن زبیربروایۃ ابی الاسود:** یہ مشہورتابعی حضرت عروہ بن زبیرؓ کاتحریر کردہ اولین مجموعۂ مغازی ہے،اس پر آپ نے تحقیق کی اوراس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء میں ریاض سے شائع ہوا۔

یہ کتاب واضح طور پر عہداول ہی سے سیرت نگاری کے تسلسل کوثابت کرتی ہے۔

دفاعی خدمات

ڈاکٹرصاحب کاعلمی جوہر دفاعی میدان میں زیادہ کھلاہے،سطرسطرمعلومات اور حقائق سے لبریز ہے،وہ تاریخ اوراسماء الرجال پر بڑی گہری نظر رکھتے اور صحیح مواقع استعمال جانتے تھے،اس باب میں ان کووہ امتیازی حیثیت حاصل تھی کہ شاید وباید، مجھےان کی کئی کتابیں دیکھنے کاشرف حاصل ہواہے،مطالعہ سے محسوس ہوا کہ اگر میں نے یہ کتابیں نہ پڑھی ہوتیں توعلم کے بڑے باب سے محروم رہ جاتا،احادیث کی پرکھ اور کتابوں پرنظر کے معاملے میں وہ اپنے بہت سے ہم عصروں پر فوقیت رکھتے تھے؛ بلکہ محدث کبیر حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کے بعدشاید ہی کوئی اور نام ان کے مقابلے میں پیش کیا جاسکے۔

حدیث کی دفاعی خدمات کے باب میں ڈاکٹرصاحب کی کئی کتابیں شاہکار حیثیت رکھتی ہیں:

منہج النقدعندالمحدثین مع کتاب التمییز-ایک عظیم کارنامہ

❁اس کاایک بڑانمونہ امام مسلم کی کتاب ''التمییز'' پران کاتحقیقی کام ہے،امام مسلمؒ کی یہ کتاب بنیادی طور پرتواصول حدیث کے موضوع پر ہے؛ لیکن اس میں بحث کابڑاحصہ حدیث کی تدوین وتحفظ کے لے متقدمین کی بے مثال جدوجہد،اورمحتاط طریقۂ عمل کے بارے میں بھی ہے، امام مسلمؒ نے اپنی اس کتاب میں ثابت کیاہے کہ محدثین نے احادیث کی حفاظت اوران کے ردوقبول کا جومعیاراختیارکیا،اس سے بہتر معیار کاتصور آج بھی ممکن نہیں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے امام مسلمؒ کی اس کتاب پر تحقیق کی،اور ایک مبسوط مقدمہ ''منهج النقد عندالمحدثين'' کے نام سے تحریر فرمایا،اس کتاب پر کام کرنے کا بہ ظاہر محرک یہ بنا کہ جامعہ اسکندریہ سے ڈاکٹر عثمان موافی کی کتاب ''منهج النقد التاريخى عند المسلمين والمنهج الأوروبى'' شائع ہوئی، جوغالبًا ان کی ڈاکٹریٹ کا مقالہ تھا،اسی موضوع پر ان کے پیشرو دکتور نورالدین عتر کی کتاب ''منهج النقد فى علوم الحديث'' بھی شائع ہوچکی تھی،ان دونوں کتابوں میں قدرِ مشترک طور پر یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ:

''مسلمانوں میں سلسلۂ سند کا آغاز بعض اسباب وحوادث کے تحت ۴۰ھ کے بعد ہوا، ورنہ اسلام کے ابتدائی دور میں نقل وروایت کا وہی سادہ طریقہ رائج تھا جو عہد جاہلیت سے عربوں میں چلا آرہا تھا،وغیرہ''۔

گوکہ ان مصنّفین کا مبلغ علمِ حدیث کی مبادیات سے آگے نہ تھا؛لیکن عام لوگوں کی تشویش واضطراب کے پیش نظر شیخ اعظمیؒ نے اس قدیم ترین مجموعہ کو سامنے لانے کا فیصلہ کیا اور مضبوط دلائل سے ثابت کیا کہ حدیث پاک کی کتابت وتدوین کا اہتمام خود عہدِ نبوت سے شروع ہوچکا تھا،اور ۴۰ھ سے بہت قبل ہی متعدد صحابۂ کرام کے قلمی مجموعے سامنے آگئے تھے(۲)۔

علاوہ اسلام میں تبلیغ اور تعلیم کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اور نقل وروایت میں کذب بلکہ شائبہ کذب سے بھی احتیاط کرنے کی جو تاکید آئی ہے،وہ بھی اس کا متقاضی ہے کہ صحابہ نے اس اہم فریضہ کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں برتی ہوگی،ڈاکٹر صاحبؒ نے متعدد روایات واحادیث سے اس موقف کو ثابت کیا ہے(۳)۔

بلکہ بقول ڈاکٹر صاحب روایت کی نقد وتحقیق کی شروعات بھی عہد نبوت میں ہی ہوگئی تھی،گوکہ اس تحقیق کا مقصد ازالۂ شک نہیں؛ بلکہ محض اطمینان قلب ہوتا تھا،خدانہ خواستہ صحابہ میں ایک دوسرے کی طرف سے کوئی بے اعتمادی ہرگز نہیں پائی جاتی تھی؛لیکن جس طرح پیغمبر خدا حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے سوال کا مقصد محض اطمینانِ قلب تھا (ليطمئن قلبى(۴))اسی طرح صحابۂ کرام بھی محض اطمینان قلب کے لیے بعض مواقع پر روایات کی تحقیق کرتے تھے۔

❁ اس کا دوسرا بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ روایت بالواسطہ کے بجائے بلاواسطہ ہوجائے،یا واسطے کم ہوجائیں۔

❁ نیز اس کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ نقد وتحقیق کا یہ رجحان آئندہ نسلوں تک منتقل ہو،اور تحفظ دین

کے باب میں امت کسی بڑے فتنے میں پڑنے سے محفوظ رہے، مثلاً:

❁ ’’دیہات سے ایک شخص (بعض روایات میں ان کا نام ضمام بن ثعلبہؓ ذکر کیا گیا ہے) خدمتِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

يا محمد! أتانا رسولُك فأخبرنا: أنك تزعُم: أن الله أرسلك، قال: صدق.

آپ کے نمائندہ نے ہمیں خبر دی ہے کہ آپ گمان کرتے ہیں کہ اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے، حضور ﷺ نے جواب میں اس کی تصدیق فرمائی، الحدیث(۵)۔

❁ حضرت علیؓ نے یمن سے واپسی پر اپنی اہلیہ حضرت فاطمہؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا، وہ کہتی ہیں کہ رنگین کپڑے پہننے اور سرمہ لگانے کا حکم آپ نے ان کو دیا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے تصدیق فرمائی کہ ہاں! میں نے حکم دیا ہے، الحدیث(۶)۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کی چھ(۶) مثالیں ذکر کی ہیں اور معتبر حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ یہ تسلسل نسبتاً زیادہ قوت کے ساتھ عہد صحابہ کے بعد بھی جاری رہا اور یہی چیز احادیث کے تحفظ وتدوین کی ضمانت بن گئی(۷)۔

❁ اس کتاب کا چھٹا باب ایک بہت ہی حساس اصولی مسئلہ ’’عدالتِ صحابہؓ‘‘ سے متعلق ہے، محدثین اور جمہور امت نے تمام صحابہ کو بلا تفریق عادل وثقہ قرار دیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے علمی اور تاریخی حوالوں سے اس موضوع کا حق ادا کیا ہے، اور تمام منطقی بنیادیں اور چھوٹی بڑی تفصیلات صفحۂ قرطاس پر جمع کردی ہیں، تقریباً کتاب کے تیئس (۲۳) صفحات میں یہ بحث پھیلی ہوئی ہے اور اس ایک کتاب نے بہت سی کتابوں سے آدمی کو بے نیاز کردیا ہے، اہلِ علم کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے، اتنی مرتب اور جامع گفتگو کم دیکھنے کو ملے گی(۸)۔

غرض پوری کتاب (جو صفحات ۲۳۴ پر مشتمل ہے) اہم مباحث سے لبریز ہے اور منکرین ومستشرقین کے تمام بنیادی شبہات کے تشفی بخش جوابات اس میں موجود ہیں۔

دراسات في الحديث النبوي وتاريخ تدوينه - متعلقات حدیث کا انسائیکلوپیڈیا

❁ ڈاکٹر صاحبؒ کا سب سے بڑا کارنامہ جو ان کی عالمی شہرت کا سبب بنا اور جس سے ان کی آئیڈیل شخصیت تیار ہوئی، وہ ہے ان کی مشہور تصنیف ”دراسات في الحديث النبوي وتاريخ تدوينه“ تقریباً سات سو بارہ (۷۱۲) صفحات میں اپنے موضوع پر اب تک کی سب سے جامع اور مبسوط کتاب ہے، جس میں حدیث کی شرعی واستدلالی حیثیت، اصطلاحاتِ حدیث، تدوین

حدیث، حدیث کے قدیم ترین مجموعے، احادیث کی صحت واعتباریت پر مستشرقین کے اعتراضات، قرونِ خیر کے نظامِ تعلیم وتدریس، عہد سلف کے کاتبین ومصنّفین حدیث کا تعارف جیسے اہم ترین مسائل ومباحث کا احاطہ کیا گیا ہے، یہ کتاب مصنف کے علم وفن کا نقطۂ ارتقا ہے، جس میں بے شمار چشمے اور ندی نالے سمٹ آئے ہیں۔

اکابر دیوبند میں حضرت علامہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی تصنیف لطیف ''تدوین حدیث'' اردو زبان میں اس موضوع پر سب سے معتبر اور مبسوط کتاب مانی جاتی ہے، جس نے مسئلہ کی بیشتر تفصیلات اپنے دامن میں سمیٹ لی ہیں، ڈاکٹر مصطفےٰ اعظمی صاحبؒ نے بھی اس کتاب سے استفادہ کیا ہے اور اس کے حوالے بھی دیئے ہیں(۹)؛ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع کو مزید وسعتوں اور امکانات سے روشناس کیا، ان کے پاس مواقع ووسائل بھی زیادہ میسر تھے، جن کا انھوں نے صحیح استعمال کیا، ان کی یہ کتاب اس موضوع پر ایک موسوعہ کی حیثیت رکھتی ہے، آج حدیث کے ہر طالب علم اور محقق کو اس سے استفادہ کرنا چاہیے، تنہا یہ ایک کتاب بہت سی کتابوں کی طرف سے کافی ہے۔

کتاب پر ایک نظر

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب نو (۹) ابواب اور کئی فصلوں پر مشتمل ہے:

❁ **باب اول:** پہلے باب میں سنت کے لغوی واصطلاحی مفہوم، قرآن وحدیث میں نیز محدثین واصولیین اور فقہاء کے یہاں اس کے استعمالات، اور مستشرقین کی تعبیرات وتصورات سے بحث کی گئی ہے، حدیث کی استدلالی حیثیت (یعنی ماخذ شریعت ہونے کی حیثیت) کو نمایاں کیا گیا ہے اور متعدد صحابۂ کرامؓ کے حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ صحابہؓ روز اول ہی سے احادیث کو ایک مصدر قانون کی حیثیت سے تسلیم کرتے تھے، جن میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبدللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، اور حضرت معاویہؓ جیسے بڑے نام شامل ہیں۔

اسی باب میں اس تاریخی حقیقت کو بھی واشگاف کیا گیا ہے کہ فتنۂ انکار حدیث کے جراثیم عہدِ صحابہ میں ہی پیدا ہونے لگے تھے؛ مگر صحابہ نے سختی کے ساتھ ان کا استیصال کیا اور اس فتنہ کو روکنے کی کوشش کی، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ:

''صحابیِ رسول حضرت عمران بن حصینؓ ایک مجلس میں احادیث رسول ﷺ بیان فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے لقمہ دیا کہ اے ابونجید! آپ ہمیں قرآن کی تعلیم دیجیے، حضرت

عمرانؓ نے حکمت کے ساتھ اس شخص کو سمجھایا کہ قرآن میں نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کا حکم آیا ہے؛ مگر ان کی تفصیلات قرآن میں کہاں ہیں؟ یہ چیزیں رسول اللہ ﷺ کے قول وعمل سے لی گئی ہیں، اس شخص کو بات سمجھ میں آ گئی اور اس نے اپنا اعتراض واپس لے لیا، حضرت حسن بصریؒ اس شخص کا نام ظاہر کیے بغیر فرماتے تھے کہ بعد میں وہ شخص مسلمانوں کے فقہاء میں شمار کیا گیا(۱۰)۔

کئی صحابہ سے اس طرح کے واقعات منقول ہیں، صحابہ نے اس قسم کے تصورات کو رد فرما دیا تھا؛ لیکن زمانہ مابعد میں یہ ایک فتنہ کی صورت میں ابھرا، اور عرب سے لے کر برصغیر تک کو اپنی زد میں لے لیا، ہر دور کے علماء اہل سنت نے اس فتنہ کا مقابلہ کیا، ڈاکٹر صاحب نے بھی اس باب میں منکرین حدیث کے دلائل وشبہات کا بالاستیعاب اور مدلل جائزہ لیا ہے اور جدید وقدیم تمام بحثوں کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ سمیٹا ہے۔

❁ باب دوم میں عرب جاہلیت کی تہذیبی وتعلیمی صورتِ حال، اسلام کی آمد کے بعد کی تبدیلیاں، تعلیم وکتابت کے لیے رسول اللہ ﷺ کی مساعی جمیلہ، مکی اور مدنی زندگی کی تفصیلات وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ جس معاشرہ کی سرشت میں لکھنے پڑھنے کا ذوق شامل ہو، اس کے بارے میں یہ خیال کس قدر احمقانہ ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی حفاظت کا اہتمام نہیں کیا؟

❁ باب سوم میں کتابتِ حدیث سے متعلق بعض روایات، یا بعض صحابہ کے طرزِ عمل کی تشریح وتوجیہ پیش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کا مقصد حدیث کی کتابت وتدوین سے روکنا نہیں؛ بلکہ قرآن وحدیث کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنا اور ان کے حدود کا تحفظ کرنا تھا، کئی مثالوں سے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

❁ باب چہارم میں حفظِ حدیث اور کتابتِ حدیث کے سلسلے میں عہد نبوی سے دوسری صدی ہجری تک کی مساعی جمیلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تقریباً پچاس (۵۰) صحابہؓ کا ذکر نام بنام کیا گیا ہے جنھوں نے حضور ﷺ کی احادیث لکھ کر محفوظ کی تھیں اور کئی حضرات نے کتابی مجموعے اور صحیفے بھی تیار کیے تھے۔

اور یہی تسلسل عہد تابعین اور تبع تابعین تک پہونچا، ڈاکٹر صاحبؒ نے معتبر حوالوں کے ساتھ تقریباً چار سو (۴۰۰) تابعین اور کچھ تبع تابعین کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، جنھوں نے تدوین حدیث کے

باب میں تاریخ کے صفحات پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔تقریباً ڈھائی سو(۲۵۰)صفحات میں یہ بحث پھیلی ہوئی ہے،مصنف نے ان صفحات میں ہزاروں صفحات کا عطر نچوڑ کر رکھ دیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اتنی تفصیل اوراستناد کے ساتھ شاید کسی اور جگہ یہ مباحث نہ مل سکیں گے۔

٭ باب پنجم قرن اول ودوم میں حدیث کی تدریس ومذاکرہ سے متعلق ہے،صحابۂ کرامؓ اورتابعین میں درس حدیث کے تعلق سے جوگرمجوشی پائی جاتی تھی،اس دور میں حدیث کی تدریس وکتابت کے جومختلف طریقے وجود میں آئے اورمدارس قائم ہوئے،اس دور کے مدارس میں طلبۂ حدیث کی تعداد اورعمریں کیا تھیں؟وغیرہ یہ تمام چیزیں تحقیق اورتفصیل کے ساتھ اس باب میں موجود ہیں۔

٭ باب ششم میں حدیث کے موضوع پرقرونِ اولیٰ میں جوتصنیفی کام ہوئے ان کا تفصیلی ذکر ہے اوراس ضمن میں بہت سی دیگر قیمتی معلومات بھی جمع ہوگئی ہیں۔

٭ باب ہفتم میں سلسلۂ سند کی ابتدا اوراس پر وارد ہونے والے اعتراضات وجوابات اور دیگر متعلقات سے بحث کی گئی ہے۔

٭ باب ہشتم میں احادیث کی صحت وتدوین پر مستشرقین بالخصوص پروفیسر شاخت کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں اور پوری دقت نظراورتحقیق کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

٭ باب نہم میں دوسری صدی کے بارہ (۱۲) قدیم ترین حدیثی مجموعوں کا ذکر ہے،جن میں ایک ہزار(۱۰۰۰) سے زائد حدیثیں موجود تھیں، غالباًان کی فوٹو کاپیاں بھی مصنف کے پاس موجود تھیں،ان میں سے ایک نسخہ ”نسخة سهيل بن أبي صالحؒ (۱۳۸ھ)عن ابيه عن ابی هريرةؓ“ تحقیق کے بعد شامل کتاب ہے۔کتاب کے آخر میں دوضمیمے بھی ہیں،جن میں طریقِ روایت ”اخبرنا“ یا”حدثنا“ وغیرہ کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اوربعض کتب احادیث میں حدیثوں کی تعدادوغیرہ پرروشنی ڈالی گئی ہے۔

غرض شیخ نے زندگی کا ایک ایک لمحہ علمِ دین اورعلمِ حدیث کے لیے نچوڑکررکھ دیا؛لیکن ان تمام فضائل وکمالات کے باوجودوہ سراپاانکسار تھے، ہمیشہ اپنی زمین سے پیوستہ رہے،عین اس مجلس میں بھی جس میں آپ کو”کنگ فیصل ایوارڈ“ سے سرفراز کیا گیا،اپنی مادرعلمی دارالعلوم دیوبند یادارالعلوم مئو کا ذکر کرنا نہ بھولے ،اپنی تقریر میں ان دونوں اداروں کوفرزندانہ خراجِ عقیدت پیش کیا،وہ اس حقیقت کوپاچکے تھے کہ:

ع پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

ان کی ولادت ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۰ء کو مئو میں ہوئی، دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں فارغ ہوئے، ۱۹۸۰ء میں کنگ فیصل ایوارڈ ملا، ۱۹۸۱ء میں سعودی شہریت حاصل ہوئی اور عمر عزیز کی ستاسی (۸۷) بہاریں دیکھنے کے بعد بروز بدھ ۲۰/دسمبر ۲۰۱۷ء کو صحبت یار آخر شد إنا للّٰہ وإنا إلیه راجعون.

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

❁ ❁ ❁

حواشی

(۱) ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے اس احساس کا اظہار کتاب التمییز للامام مسلمؒ کے مقدمہ میں بھی کیا ہے: بسا اوقات ہم کسی مخطوطہ کو گم شدہ تصور کر لیتے ہیں؛ جب کہ وہ بعد والوں کی محنت سے دریافت ہوجاتا ہے، اسی طرح کبھی بزرگوں کے مقابلے میں جوانوں کی محنت زیادہ وقیع ثابت ہوتی ہے اور کسی مخصوص میدان میں بعد کے لوگ سابقین پر سبقت لے جاتے ہیں:

ومن جهة أخرى تكتشف مخطوطات جديدة كان يظن انها مفقودة فاصبحت مكتبة السنة النبوية بكثير مما كانت عليه قبل قرن او قرنين من الزمان واصبح الاعتناص بها افضل مما كان من قبل... فى هذه النهضة قد ساهم ويساهم الشباب والشيوخ.... (مقدمة كتاب التمييز، ص۵، طبع اوّل ۱۳۹۵ھ)

(۲) **مقدمة كتاب التمييز** ص۵ تا ۷ طبع اوّل ۱۳۹۵ھ

(۳) **منهج النقد عند المحدثين للاعظمی**، ص۳-۵.

(۴) البقرة: ۲۶۰۔

(۵) الجامع الصحيح المسمى صحيح مسلم ج ۱ ص ۱۳۲ حديث نمبر: ۱۱۱ المؤلف: أبو الحسين مسلم فن الحجاج بن مسلم القشيري النيسابوري المحقق: الناشر: دارالجيل بيروت، دارالأفاق الجديدة. بيروت الطبعة: حطط الأجزاء: ثمانية اجزاء في أربع مجلدات. سنن النسائي الكبرى ج۳ ص ٤٣٧ المؤلف: أحمد بن شعيب أبو عبدالرحمن النساي، الناشر: دارالكتب العلمية – بيروت الطبعة الأولى ١٤١١–١٩٩١ تحقيق: د. عبدالغفار سليمان البنداری، سيد كسروي حسن عدد الأجزاء:٦.

(۶) الجامع الصحيح المسلمى صحيح مسلم ج ٤ ص ٣٩ حديث نمبر: ٣٠٠٩ المؤلف: أبوالحسين مسلم بن الحجاج بن مسلم القشيري النيسابوري المحقق: الناشر: دارالجيل بيروت. داالأفاق الجديدة. بيروت الطبعة: عدد الأجزاء: ثمانية أُزاء في أربع مجلدات.

(۷) منهج النقد عند المحدثين للاعظمیؒ ص ٧-١٠.

(۸) منهج النقد عند المحدثين للاعظمیؒ ص ١٠٣-١٢٦.

(۹) دیکھئے: دراسات في الحديث النبوي و تاريخ تدوينه للاعظمی ص ٥٩٨ وغیرہ.

(۱۰) دراسات فی الحديث النبوی ص ٢١ بحواله المستدرك ج ١ ص ١٠٩، ١١٠.

❁ ❁ ❁

مفکرملت مولانا عبداللہ صاحب کاپودرویؒ: نقوش وتأثرات

از: مفتی اشرف عباسؔ صاحب قاسمی
استاذ تفسیر وادب دارالعلوم دیوبند

گزشتہ ۱۰/جولائی ۲۰۱۸ء کی سہ پہر تقریبا ۳/بجے مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودرویؒ کے انتقال کی خبر نے قلب وجگر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، زبان سے بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون کا کلمہ ادا ہوا، اس کے ساتھ ہی دل ودماغ میں حضرت مولانا کی دل آویز، مردم گر اور عہد ساز شخصیت کی زندگی کے مختلف نقوش، اور اخلاق کریمانہ کی مختلف صورتیں مرتسم ہوتی گئیں۔ حضرت مولانا گجرات کی جان اور ملک کی شان تھے، گجرات میں علم ومعرفت کی اس وقت جو بادبہاری ہے اور علم وتحقیق کی جتنی انجمنیں اور ادارے قائم ہیں، آپ سب کے سرپرست اور روح رواں تھے۔ آپ کی وفات یوں تو اسلامیانِ ہند کے لیے ایک بڑا حادثہ ہے؛ لیکن اس وقت گجرات کا سب سے بڑا سرمایہ وہی تھے، وہی ایک چراغ تھا جس سے سارا گھر روشن تھا۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی وفات اس صدی کے گجرات کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔

وطن اور پیدائش: اصل وطن جیتالی، تحصیل انکلیشور، ضلع بھروچ ہے۔ والد گرامی جناب اسماعیل حسین پٹیل، مقامی اسکول میں چند سال رہ کر تجارت کے لیے برما چلے گئے تھے، اور برما میں شان اسٹیٹ نامی صوبہ کے ہیہو نامی شہر میں کاروبار شروع کیا، اسی شہر میں ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں آپ کی پیدائش ہوئی۔

خاندانی ماحول: آپ کا گھرانہ متدین اور دین دار تھا، والد صاحبؒ کا برما اور ہندوستان کے بزرگوں خاص کر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور آپ کے خلفاء سے عقیدت مندی کا تعلق تھا،

حضرت تھانویؒ سے بیعت بھی تھے؛ اس لیے والد صاحب نے پانچ بیٹیوں کے بعد پیدا ہونے والے اپنے اس فرزند کی پیدائش کی اطلاع حضرت تھانوی کو دے کر دعا کی گزارش کی، جواب میں حضرت تھانویؒ نے اس نومولود کو اپنی خاص مستجاب دعاؤں سے نوازا۔ ۱۹۳۵ء کے اواخر میں والد صاحب برما چھوڑ کر ہندوستان آگئے، اور ''کاپودرا'' میں مستقل سکونت اختیار کرلی، اسی نسبت سے کاپودروی مشہور ہوئے۔ والد صاحب چوں کہ علما ومشائخ کے صحبت یافتہ اور عقائد واعمال میں پختہ تھے؛ اس لیے انھوں نے اپنے اس فرزند عزیز کی نہایت توجہ کے ساتھ دینی خطوط پر تربیت کی اور بچپن سے ہی جماعت کی پابندی اور تلاوت کی عادت ڈالی۔

تعلیم: خاندان میں عموماً اعلیٰ انگریزی تعلیم کا رواج تھا، بعض چچا جج تھے، کوئی تحصیل دار اور کوئی فوج دار، چچازاد بھائی وکیل تھے، اس لیے خاندان والوں کا اصرار آپ کے لیے بھی عصری تعلیم کا ہی تھا، لیکن والد صاحب نے نہایت استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ کے لیے دینی تعلیم کی ہی راہ منتخب کی۔ حضرت مولاناؒ اس صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں: اگر والدین کی استقامت نہ ہوتی تو آج میں بھی حکومت کے دفتر میں ہوتا یا افریقہ کے کسی شہر میں زندگی گزرتی۔'' (گلدستۂ محبت ۴۵)

قرآن کریم، ابتدائی اردو فارسی اور اسکول کی درجہ پانچ تک کی تعلیم کاپودرا میں ہوئی، ۱۹۴۴ء میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں داخل ہوکر فارسی سے عربی دوم تک کی کتابیں پڑھیں، ۱۹۴۸ء میں دیوبند کا سفر کیا اور دارالعلوم میں عربی سوم میں داخلہ لیا، لیکن چہارم کے سال مہینوں بیمار رہنے کے سبب درمیان سال میں ہی گھر واپس آنا پڑا، اور دوبارہ ڈابھیل میں داخل ہوکر وہیں سے سند فراغت حاصل کی۔ ۶۰/۱۹۵۹ء میں ایک مناسبت سے دارالعلوم دیوبند میں دوسال قیام کا موقع ملا، جس میں دارالعلوم کے کبار اساتذہ سے استفادے کے خاص مواقع حاصل رہے۔

تدریس واہتمام: ۱۹۵۴ء میں پہلی بار جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تدریس کے لیے تقرر ہوا، ابتدائی عربی درجات کے اسباق متعلق ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند سے واپسی کے بعد مارچ ۱۹۶۲ء میں دوبارہ جب ڈابھیل بلائے گئے تو چند اسباق کے علاوہ انتظامی ذمہ داریاں بھی آپ کو تفویض کی گئیں۔ ۱۹۶۶ء میں فلاح دارین ترکیسر تشریف لے آئے، کار اہتمام کے ساتھ مختلف فنون کی کتابوں کی تدریس بھی آپ سے متعلق رہی، ۱۹۹۳ء تک فلاح دارین سے باضابطہ وابستگی رہی، آپ کا دور اہتمام فلاح دارین کی تاریخ کا وہ عہد میمون ہے جس نے اسے ملک کے ممتاز مدارس

کی صف میں لاکھڑا کیا۔اس کے بعد آپ کا قیام زیادہ تر ٹورنٹو (کنیڈا) اور اپنی بستی کا پودرا میں ہی رہا۔اور یہیں سے مدارس ومعاہد کی سرپرستی فرماتے رہے۔تا آں کہ گزشتہ ۱۰ر جولائی ۲۰۱۹ء کو یہیں آخری سانس لی۔

تصنیفات: ابتدا سے ہی عربی، اردو اور مقامی زبان گجراتی کا آپ کو صاف ستھرا ذوق رہا ہے، اور تینوں زبانوں میں آپ کی قابل قدر تصنیفات موجود ہیں۔عربی میں بہ راہ راست تصانیف بھی ہیں، اور بعض عربی کتابوں کے ترجمے بھی۔جن میں سے چند یہ ہیں: (۱) **أضواء علی تاریخ الحرکة العلمیةوالمعاهد الاسلامیة والعربیة في غجرات**، (۲) علامہ عینی اور علم حدیث میں ان کا نقش دوام، عربی سے ترجمہ۔(۳) مکارم الشیم ترجمہ ''**عنوان الحکم**'' لابی **الفتح البستی**۔(۴) ترجمہ دیوان امام شافعیؒ۔(۵) رشد وہدایت کے منار جن سے میں نے کسب فیض کیا۔(۶) افکار پریشاں، مجموعہ مضامین ومقالات۔(۷) مقدمات کاپودروی۔(۸) علامہ حارث محاسبی کے رسالہ المسترشدین پر شیخ عبدالفتاح کی تعلیقات کا اردو ترجمہ۔(۹) علامہ محمد یوسف بنوریؒ اور خدمات حدیث۔(۱۰) ''صدائے دل'' خطبات اور مواعظ کا مجموعہ۔

نیازمندانہ تعلق: مولانا کاپودریؒ، نابغۂ روزگار عبقری شخصیات میں تھے،علم دوستی،خردنوازی اور رجال سازی ان کے خاص اوصاف تھے جوانہیں اپنے معاصر علماء میں خاص مقام وامتیاز عطا کرتے ہیں، بندۂ ناچیز کا حضرت مولانا کے ساتھ نیازمندانہ تعلق جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ کے زمانۂ طالب علمی سے ہی ہے،اس زمانے میں مولانا فلاح دارین سے علاحدہ ہوکر کناڈا میں مقیم تھے اور ہندوستان آمد پر کبھی کبھار ہانسوٹ بھی قدم رنجائی فرماتے ،۲۰۰۱ء کے بعد جب ہانسوٹ میں ہی تدریسی خدمات کا آغاز ہوا تو حضرت مولانا کو قریب سے دیکھنے اور آپ کی جامع الکمالات شخصیت سے استفادے کے مواقع نصیب ہوئے ، جامعہ میں کوئی بھی قابل ذکر علمی تقریب ہوتی یا تربیتی پروگرام ہوتا تو جامعہ کے مہتمم و بانی حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب مظاہری حفظہ اللہ آپ کو ضرور مدعو کرتے اور بسا اوقات مجھے ہی پروگرام مرتب کرنے اور حضرت کی راحت کا خیال رکھنے کا حکم دیتے۔ اجتماعی خطابات کے علاوہ کوئی کوشش ہوتی تھی کہ مختلف جماعتوں کو رئیس الجامعہ کے سامنے پیش کرکے آپ کی قیمتی آراء سے استفادہ کیا جائے ،اس میں حضرت رحمہ اللہ کی بھی بڑی بشاشت رہتی تھی بالخصوص اس سبب سے بھی کہ یہاں کے حسن انتظام اور تعلیم وتربیت کی رعنائی میں آپ کو اپنے نظام و انداز تربیت کا عکس نظر آتا تھا، بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک ایک جماعت سے دو

دو گھنٹے تک سوالات کرتے رہے اور اپنے علم و تجربات کے موتی لٹاتے رہے۔

ہانسوٹ قیام کے دوران جب بھی کاپودرا در دولت پر حاضری ہوتی؛ ہمیشہ اکرام و تشجیع کا معاملہ فرماتے، میری کج مج تحریروں کو بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور موضوع سے متعلق مزید مراجع و مصادر کی نشاندہی فرماتے، بسا اوقات کوئی علمی کتاب بھی ہدیۃً عطا فرماتے تھے۔

بصیرت و دوررسی: حضرت کی شفقتوں سے شہ پا کر کبھی کبھی طویل ٹیلی فونی گفتگو بھی کر لیتا، حضرت مولانا نہایت دوررس نگاہ رکھتے تھے، اور کبھی چند جملوں میں آنے والے حالات کی تہہ میں پوشیدہ طوفان کی طرف اشارہ کر دیا کرتے تھے؛ چنانچہ جس دن ام المدارس دارالعلوم دیوبند کے عہدۂ اہتمام کے لیے مخدوم گرامی حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی کے انتخاب کی خبر آئی تو اس دن شام کو میں نے حضرت رئیس الجامعہ کو فون کیا کہ آپ اس باوقار عہدے کے لیے اپنے تلمیذ اور فیض یافتہ کے انتخاب پر مبارکباد قبول فرمائیں، میں نے نہایت پرجوش انداز میں کلمات تہنیت پیش کیے، مجھے اسی انداز سے جواب کی توقع تھی؛ لیکن اس کے برعکس آپ نے مبارکبادی پر ٹھہرے ہوئے انداز میں شکریہ ادا کرتے ہوئے جو کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''مولانا! مجھے اس انتخاب کے تعلق سے کئی خدشات ہیں، دیکھیے! آگے کیا حالات آتے ہیں، اللہ پاک دارالعلوم کی اور مولانا کی حفاظت کرے۔'' میں نے بہ زعم خود اس کو بے وقت کی راگنی خیال کیا؛ لیکن اس کے چند دن بعد ہی جو حالات آئے اس نے مجھے ایک بار پھر آپ کی بصیرت اور دوربینی کا قائل کر دیا۔

گجرات کے تئیں فکرمندی: ۲۰۱۳ء میں جب ہانسوٹ میں گیارہ سالہ تدریس کے بعد اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل خاص سے بغیر کسی استحقاق کے دارالعلوم دیوبند میں خدمت تدریس کی سعادت عطا کی تو اگرچہ مولانا کو میری اس تقرری پر مسرت تھی اور ان کی دعاؤں اور توجہات کا اس میں بڑا دخل تھا؛ لیکن جب میں نے باضابطہ اس کی اطلاع دی تو فرمانے لگے کہ ''مولانا آپ کو مبارک ہو؛ لیکن مجھے اس کا بھی بڑا قلق ہے کہ ہمارے گجرات کو ایک باصلاحیت علمی ذوق کے حامل استاذ سے محروم ہونا پڑ رہا ہے۔'' اس سے آپ کی خردنوازی کے ساتھ اپنے صوبے کے تئیں فکرمندی کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا، آپ کا یہی کڑھن تھا جس نے آپ کو گجرات کی محبوب ترین شخصیت بنا دیا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گجرات کے مدارس میں جو پچھلے چند سالوں کے دوران تعلیم تربیت کے حوالے سے حساسیت آئی ہے اس میں مولانا کی فکروں اور بار بار توجہ دلانے اور آپ کے تیار کردہ فلاحی فضلاء کی کھیپ کو بڑا دخل ہے۔

خردنوازی: میرے دیوبند پہنچنے کے بعد بھی آپ کی عنایتوں کا سلسلہ جاری رہا، پہلی بار دیوبند تشریف لائے تو آپ کے پاس میرا رابطہ نمبر نہیں تھا، آپ نے دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی سے میرا تذکرہ کیا، حضرت مہتمم صاحب نے فوراً مجھے آپ کی ملاقات کے لیے کہلوایا، میں حاضر ہوا، حضرت بڑے تپاک سے ملے، میں نے صبح ناشتے کی دعوت پیش کی، حضرت مولانا کی کرم گستری اور عالی ظرفی تھی کہ آپ صبح کو اپنے رفقاء کے ہمراہ محلّہ خانقاہ میں واقع کرایے پر لیے ہوئے احقر کی معمولی قیامگاہ پر جہاں سردی اور گرمی سے صحیح حفاظت بھی نہیں ہوپاتی، تشریف لے آئے، جو کچھ پیش کیا جاسکا بڑی بشاشت سے اس کو تناول فرمایا، یقیناً حضرت مولانا کی عظمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ انھوں نے مجھ جیسے ایک گاؤں کے رہنے والے معمولی انسان کی دعوت پر اپنی تمام تر عظمتوں کے ساتھ قدم رنجائی فرماکر ’’کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید‘‘ کا عملی ثبوت دیا۔ فجزاہ اللہ خیرالجزاء۔

دارالحدیث میں طلبہ سے خطاب: آپ سے ملاقات اور استفادے کی ایک صورت یہ نکل آئی کہ آپ وقف دارالعلوم دیوبند کی مجلس مشاورت کے رکن منتخب ہوئے، اس کے اجلاس میں شرکت کے لیے دیوبند آمدورفت بڑھ گئی۔ اور ہماری ایک دیرینہ تمنا برآئی۔ ایک بار وقف کی مشاورت میں تشریف آوری کے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے دارالحدیث تحتانی قدیم میں سجاد لائبریری کے اجلاس عام میں شرکت کی گزارش کی گئی، حضرت والا تشریف لائے، طلبہ کی خاصی بھیڑ اکٹھی تھی، آپ نے طلبہ سے علالت کے باوجود بڑی بشاشت کے ساتھ وقیع خطاب فرمایا؛ اگرچہ اس پروگرام میں دیر تک شریک رہنے کے سبب رات میں نیند نہیں آئی اور آپ کے فرزند محترم مولانا اسماعیل صاحب جو حضرت کی راحت رسانی کے معاملہ میں ہمیشہ حساسیت کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں؛ کی خفگی کا سامنا کرنا پڑا، غالباً یہ تقریر ریکارڈ بھی کرلی گئی تھی، اگر صدائے دل کے کسی حصے میں شائع ہوجائے تو اس سے استفادہ عام ہوجائے گا۔

دارالعلوم دیوبند سے تعلق خاطر: دارالعلوم دیوبند سے آپ کو قلبی اور جذباتی لگاؤ تھا آپ نے اپنی زندگی کے قیمتی چار سال اس کی علمی وروحانی فضاؤں میں گزارے تھے، یہاں کے مشائخ واکابر اساتذہ سے براہ راست استفادہ کیا تھا، شیخ عبدالوہاب محمود مصری سے بھی آپ نے یہیں عربی زبان و ادب کے اسالیب سیکھے، مولانا عمید الزماں کیرانویؒ کے ساتھ مل کر پہلی بار عربی مجلّہ ’’الیقظہ‘‘ نکالا، اس کے در و بام سے آپ کو محبت تھی، دارالعلوم کے اپنے اساتذہ کے تذکرے پر کھل اٹھتے، خاص کر زندگی

کے آخری ایام میں اس محبت میں زیادہ جوش نظر آنے لگا تھا، آپ نے دو سال قبل مجھے ایک بار فون کر کے کہلوایا کہ میرے لیے دیوبند میں کہیں کمرے کا انتظام کرو! میں چاہتا ہوں کہ پندرہ بیس دن وہیں قیام کرلوں، مجھے شدت سے طالب علمی کے گزرے ہوئے ایام کی یاد آرہی ہے۔

دردِ دل: میں نے محسوس کیا کہ دیوبند میں جب بھی ملاقات ہوتی آپ بہت کھل کر گفتگو کرتے، آپ نے اس دوران بہت سے ایسے حقائق سے بھی پردہ اٹھایا جنہیں سن کر میں دنگ رہ گیا، اگر قلم سب اگل دے تو بہت سے جبہ و دستار والوں پر زد پڑے گی، مجھے ان مواقع پر محسوس ہوا کہ اس پیرمغاں نے نہ جانے کتنے رازہائے سربستہ اپنے سینے میں محفوظ کر رکھے ہیں اور بہت سے وہ حضرات جن سے آپ کا قلب چھلنی ہوا؛ آپ زندگی بھر ان سے اسی اخلاق کریمانہ سے ملتے رہے کہ انہیں احساس تک نہیں ہونے دیا۔

تربیت کا خاص انداز: حضرت مولانا کے رشتے کے پوتے عزیز گرامی مولوی سلیمان سعادتی مقیم کویت نے شادی کی تقریب میں مجھے خصوصیت کے ساتھ باصرار مدعو کیا، میں نے بھی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات اور جامعہ ہانسوٹ کی زیارت جیسے کئی مقاصد کے پیش نظر ہامی بھرلی اور تقریب کے دن کا پودرا حاضر ہوگیا، جمعہ کے بعد نکاح ہونا تھا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ہی جمعے سے پہلے خطاب کا حکم دیا؛ لیکن اس دوران کئی مشائخ اور علماء تشریف لائے جن میں ایک نمایاں ممتاز عالم دین تھے، میں نے حضرت مولاناؒ سے بات کر کے انہیں کا خطاب طے کروا دیا، مولانا بھی کسی درجے میں آمادہ ہوگئے، معروف عالم دین کا خطاب تو ہوا؛ لیکن نکاح کے بعد بندے پر جی بھر کر ناراض ہوئے کہ آپ کو ہی اس موقع پر تقریر کرنی چاہیے تھی؛ لیکن آپ نے میری منشاء کا خیال نہیں رکھا تو دیکھئے کیسی صورت حال پیش آئی۔ مجھے بھی تنبہ ہوا کہ بڑوں کی منشا اور اشاروں کا خاص خیال رکھا جانا چاہیے۔

حضرت سے آخری ملاقات: حضرت سے دیوبند میں آخری ملاقات ڈیڑھ سال قبل وقف دارالعلوم کی مجلس مشاورت کی مناسبت سے ہوئی، اس وقت قیام حضرت مولانا سفیان صاحب قاسمی دامت برکاتہم کے ذاتی مہمان خانہ کے بہ جائے قلب شہر میں واقع رانا گیسٹ ہاؤس میں تھا، اطلاع ملتے ہی مولوی اسحاق بارڈولی کے ہم راہ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا، علالت اور ناسازئ طبیعت کے باوجود بڑی بشاشت سے ملے، حضرت کے رفیق سفر فرزند گرامی جناب مولانا اسماعیل صاحب بھی بڑی محبت اور اپنائیت سے ملے، بہ قائمی ہوش وحواس حضرت سے یہ آخری ملاقات تھی، کیوں کہ

وفات سے پانچ روز قبل بھی میں بہ غرض عیادت حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کا والا نامہ لے کر کاپودرا حاضر ہوا تھا؛لیکن اس وقت غشی کی کیفیت تھی،اس لیے صرف زیارت ہی ہوسکی۔

بہ ہر حال گیسٹ ہاؤس کی اس ملاقات میں حضرت نے اس قدر شفقت اور اپنائیت کے کلمات دوران گفتگو فرمائے کہ عزیز مولوی اسحاق فلاحی قاسمی بعد میں کہنے لگے:''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ رئیس آپ کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں اور آپ سے اس قدر لگاؤ ہے''۔یہ گفتگو اس وقت ہوئی تھی جب جامعہ ہانسوٹ کا قضیۂ نامرضیہ پیش آچکا تھا،حضرت مفتی عبداللہ صاحب دامت برکاتہم پانولی تشریف لے جاچکے تھے،اس پوری صورت حال پر حضرت مولاناؒ نے اپنے بے پناہ کرب کا اظہار کیا اور صورت حال سے نمٹنے کے لیے مولاناؒ نے جو کوششیں کی تھیں اس کا تفصیل سے تذکرہ کرتے ہوئے شدت جذبات سے کئی بار آنکھیں نم ہوگئیں۔

ناقدری کا شکوہ نہیں: مولاناؒ مرحوم یقیناً نسل نو کے مربی اور انفرادی خصوصیات کے حامل رجال ساز شخص تھے۔''حاضر سے بےزاری اور غائب کی تلاش'' ہماری قوم کا عام مزاج ہے،کوئی کتنا ہی باکمال ہو مرنے کے بعد ہی اس کی عظمت کے گن گائے جاتے ہیں؛لیکن حضرت مولانا کے سلسلے میں ہمارا یہ تاثر ہرگز نہیں ہے کہ اہل گجرات نے زندگی میں آپ کی قدر نہیں کی؛ بلکہ مولاناؒ کی ہمہ گیر تربیت کے نتیجے میں جو خوش گوار اور مثبت تبدیلی گجرات میں محسوس کی جارہی ہے،اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حین حیات میں بھی گجرات اور ملک کے مقتدر علماء نے آپ کی خاص قدر ومنزلت کی، گجرات میں آپ کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ ہر خطے کے عوام اور مدرسے کے ذمہ داران دیدہ ودل آپ کے لیے فرش راہ کیے رہتے تھے،ہر مدرسہ آپ کا اپنا مدرسہ تھا؛ بلکہ آپ کی گجرات میں وہ حیثیت تھی جو کسی زمانے میں رے شہر میں عبداللہ بن مبارکؒ کی تھی،آپ اس پورے خطے کے شیخ الاسلام اور مرشد وامام تھے،آپ کے شاگردوں نے پوری دنیا میں آپ کو مدعو کرکے آپ کا تعارف کرایا،باہمت فضلاء نے زندگی میں بھی''گلدستۂ محبت''تیار کرکے آپ کے مشام جان کو معطر کرنے کی کوشش کی، مخدوم گرامی حضرت مولانا حنیف صاحب لوہاروی دامت برکاتہم نے زندگی کے آخری ایام میں آپ کے نام سے شاندار لائبریری قائم کرکے آپ کے قلب ونظر کے لیے سرور بخش کام کیا،آپ کے نام پر قائم اکیڈمی نے آپ کی زندگی میں ہی پھل دینے شروع کردئے تھے۔اس لیے گجرات کے عوام وخواص اس بات کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے احسان شناسی کا فریضہ بہ حسن وخوبی انجام دیا۔تاہم آپ کے تعلیمی وتربیتی مشن اور سرگرمیوں کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھنا اور آپکے

تخیلات میں رنگ بھرتے رہنا ہی آپ کو اصل خراج عقیدت ہے۔

لذیذ تر بود و لے دراز تر نہ گفتم: بہ ہر حال مفکر ملت حضرت مولانا کاپودرویؒ کے ساتھ میرے نیازمندانہ تعلقات کی داستان طویل ہے، میں نے مولانا کی زندگی اور باکمال شخصیت سے اپنے ظرف کے بہ قدر بہت کچھ سیکھا ہے، لیکن عام قاری کے لیے ہوسکتا ہے اس میں کوئی خاص دل چسپی نہ ہو؛ اس لیے حکایت کے لذیذ تر ہونے کے باوجود اسے دراز تر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ مرحوم کی زندگی کے سوانح نگار تفصیلات لکھتے رہیں گے۔ مگر عقیدت کی چند سطریں ایک نیازمند کی طرف سے یادگار اوراق رہیں، تو شاید محسن کے شکریے کا بار اس کے کندھے سے کم ہو۔

الوداع اے مفکر ملت الوداع! مفکر ملت مولانا کاپودرویؒ عمر طبعی گزار کر اپنے رب کے حضور ایسی جگہ پہنچ چکے، جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا، ان کی وفات پر ہزاروں دل تڑپے، ہزاروں آنکھوں نے آنسو بہائے۔ لاکھوں کے مجمع نے باچشم تر الوداع کہا۔ تاہم انہوں نے نسل نو کے تن مردہ میں جس طرح نئی جان ڈال دی ہے اور گجرات سے علم و معرفت اور ادب و تحقیق کے جو سوتے جاری کیے ہیں، اس سے آئندہ نسلوں کے قلب و ذہن کو بھی غذا فراہم ہوتی رہے گی، میں نہیں سمجھتا کہ ماضی قریب کے گجرات میں مولاناؒ کی ہم پلہ کوئی شخصیت گزری ہے، جس نے ماحول پر اس قدر گہرا صالح اثر چھوڑا ہو اور جس کے نقش پا کو لوگ اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانا چاہتے ہوں، آئندہ گجرات کی کوئی علمی یا دینی تاریخ مولاناؒ جیسے تاریخ ساز شخص کے ذکر کے بغیر نامکمل اور ادھوری رہے گی۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آپ کی تربت پر اللہ پاک کی کروڑوں رحمتیں ہوں اور آپ کو اعلیٰ علیین میں مقام بلند نصیب ہو۔ آمین

❁ ❁ ❁

احوال وکوائف

از: مولانا محمداللہ قاسمی
شعبۂ انٹرنیٹ، دارالعلوم دیوبند

تعطیل عیدالاضحیٰ اور اساتذۂ دارالعلوم کا سفرحج

۲۹/ذیقعدہ ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۲/اگست ۲۰۱۸ء کو دیوبند واطراف دیوبند میں مطلع ابرآلود تھا۔ اسی طرح ملک کے دیگر علاقوں میں کہیں بارش اور کہیں مطلع ابرآلود ہونے کی اطلاع موصول ہورہی تھی؛ لیکن ملک کے کچھ دیگر مقامات جیسے کرمالی، راندیر، ہانسوٹ، کھروڈ (گجرات) اور سندھوا (مدھیہ پردیش) میں چاند دیکھا گیا اور چاند دیکھنے والوں سے رابطہ ہوا اور انھوں نے تصدیق کی؛ اسی لیے دارالعلوم دیوبند کی رویت ہلال کمیٹی نے اعلان کیا کہ ۲۹/ذیقعدہ کی رویت ثابت ہوگئی ہے؛ اس لیے دوشنبہ ۱۳/اگست کو ذی الحجہ ۱۴۳۹ھ کی پہلی تاریخ ہوگی اور ۲۲/اگست ۲۰۱۸ء بروز چہارشنبہ عیدالاضحیٰ منائی جائے گی۔

دارالعلوم دیوبند میں حسب معمول ۶ تا ۱۵/ذوالحجہ عیدالاضحیٰ کی تعطیل ہوئی اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد اپنے گھروں کو روانہ ہوئی۔ عیدالاضحیٰ کی چھٹیوں میں حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم بھی اپنے وطن مالوف بنارس تشریف لے گئے اور حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی نے قائم مقام مہتمم کے فرائض انجام دیے۔ ۲۲/اگست بروز بدھ مسجد رشید میں عیدالاضحیٰ کی نماز ادا کی گئی اور قربانی کے تینوں ایام میں دارالعلوم میں قربانی کا نظم بھی کیا گیا تھا۔

اللہ تعالی کے خصوصی فضل وکرم سے اس سال بھی دارالعلوم دیوبند سے وابستہ متعدد افراد نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی ۔ خادم الحرمین کی دعوت پر مولانا خورشید انور صاحب گیاوی اور مولانا مصلح الدین صاحب سدھارتھ نگری نے حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔ علاوہ ازیں، مولانا

حسین احمد صاحب ہری دواری، قاری شفیق الرحمٰن صاحب بلند شہری اور قاری محمد طارق صاحب لکھیم پوری (اساتذۂ دارالعلوم) حج وزیارت کی دولت بے بہا سے بہرہ ور ہوئے۔ اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازے اور ہم سب کو حج مبرور نصیب فرمائے۔

حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب کو عربی خدمات کے لیے صدر جمہوریہ ایوارڈ

دارالعلوم دیوبند کے موقر استاذ حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب کو عربی زبان وادب کی نمایاں خدمات انجام دینے کے لیے ۲۰۱۷ء صدر جمہوریہ ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ۱۵؍اگست کو وزارت ترقی انسانی وسائل کی طرف سے جاری کردہ پریس نوٹ میں عربی اور دیگر کئی زبانوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی شخصیات کو صدر جمہوریہ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان وادب کے استاذ اور دارالعلوم کے عربی ترجمان مجلّہ ماہنامہ الداعی کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ ماہنامہ الداعی نے عربی صحافت کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور اس کی تحریریں عالم عرب میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ حضرت مولانا مسلسل چار دہائیوں سے عربی ادب وصحافت سے وابستہ ہیں اور اس وقت انھیں عربی زبان کے نمایاں ادیب اور بابصیرت صحافی کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اب تک آپ کی ایک درجن سے زائد عربی اور اردو کتابیں شائع ہوکر قبول عام حاصل کرچکی ہیں جن میں ”مفتاح العربية“، ”فلسطين في انتظار صلاح دين“، ”متى تكون الكتابات مؤثرة“، ”وہ کوہ کن کی بات“، ”پسِ مرگ زندہ“ وغیرہ اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔

❁ ❁ ❁